چھلکے ہی چھلکے
فکر تونسوی

چھلکے ہی چھلکے

(طنزیہ مضامین)

CHILKE HI CHILKE

BY

FIKER TONSVI

PRICE Rs. 25/-

فکرؔ تونسوی

جملہ حقوق .... قارئین کے نام محفوظ

سنِ اشاعت 1984ء

تعدادِ اشاعت .... رازِ سربستہ

قیمت .... -/۲۵ روپے (مفت خوروں کے لئے خریدنا منع ہے)

پبلشر .... وہی پرانا ....

اہلو والیہ بک ڈپو
9988 نیو روہتک روڈ
پوسٹ بکس نمبر 2507
نئی دہلی نمبر 110005

(نعمانی پریس دہلی)

اُس غیور سانپ کے نام —
جو مجھے نہ مار سکا تو خود مر گیا

اندر پڑھیے

ہیون سانگ دلّی میں

بل ڈاگ ادر ہی ہی —

کال بیل، آہنی مین گیٹ کے دائیں پہلو میں فکس (x ا ہمر) تھی۔ اُس زمانے میں ہندوستانی باشندے کال بیل کھلی چھوڑ دیتے تھے، آہنی گیٹ بند رکھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ہر نووارد چور ہوتا ہے، جب تک وہ خود نہ ثابت کر دے کہ میں چور نہیں ہوں (چور میرے بعد آئے گا)

کال بیل یوں بج اٹھی، جیسے کسی رقاصہ نے پاؤں کا گھنگھرو چھنکایا ہو۔ چور ہو یا سادھو، اس کے استقبال میں نغمہ اور آہنگ ضرور ہونا چاہیے۔ بلا سے یہ نغمہ کچھ لمحوں بعد تلوار کی جھنکار میں بدل جائے۔ ہیون سانگ کو ریلوے اسٹیشن پر لکھا ہوا یہ بورڈ پھر یاد آ گیا۔

"ہم امن چاہتے ہیں لیکن جنگ کے لئے بھی تیار رہیں۔"

"ہم چور کے یار ہیں، لیکن ہتھکڑیاں بھی تیار کرتے ہیں۔"

باہر سے کال بیل بجی تو زور سے ایک بل ڈاگ بھی بج اٹھا۔ یہ ناٹے قد کا مگر خوب موٹا تازہ بل ڈاگ تھا۔ اس کے دھڑ کا منہ والا حصہ گردن سمیت، گوشت پوست سے لدا پھندا تھا۔ بلکہ اُس حصے کو آپ کسی حد تک زنانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن نچلا دھڑ جو دم تک پھیلا ہوا تھا حسینہ کی پتلی کمر کا گمان پیدا کرتا تھا۔ پہلی نظر میں آپ اُسے ایک اَن میل بے جوڑ حُسن کہہ کر دستِ تاسف بھی مل سکتے تھے کہ خداوند کریم نے کیسی کیسی عبرتناک چیزیں دنیا میں بھیج دی ہیں۔

ہیون سانگ نے بھی دستِ تاسف ملا۔ لیکن بعد میں جب اُس کی ملاقات مکان مالکہ شبھا رانی سے ہوئی تو پہلی ہی نظر میں اُسے یوں لگا کہ ہیئت کذائی میں یہ معزز خاتون بھی بل ڈوگ کا چربہ ہی تھی۔ اُوپر کا دھڑ دلربا، نچلا دھڑ بھونڈا۔ خداوند کریم انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں برتتا۔ جس نسل میں عبرتناک انسان پیدا کرتا ہے، اسی نسل میں عبرتناک جانور بھی پیدا کر دیتا ہے۔ تاکہ دنیا میں جا کر وہ ایک ساتھ بھائی چارہ سے رہ سکیں۔

"سبحان تیری قدرت!" ہیون سانگ کے منہ سے نکلا اور اس کے ساتھ ہی ایک نیلی پوش نوجوان ملازم، بل ڈوگ کو بیک وقت جھاڑتا اور پچکارتا ہوا نمودار ہوا۔ اور ہیون سانگ سے ہندوستانی معاشرے کی ملاوٹی زبان میں بولا "ڈونٹ مائنڈ سر! یہ صرف بھونکتا ہے، کاٹتا نہیں ہے۔"

"میں ایک ہندوستانی سیاح ہیون سانگ ہوں۔"

"یس یس سر! ہمارے گیسٹ ہاؤس میں سب ہیون سانگ ہی آتے ہیں۔ اندر تشریف لائیے۔"

ہری ہری روشوں کے اندر سنگ مرمر کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہیون سانگ سامنے کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ جس کے آہنی ستون کسی معزول شہنشاہ کے قلعے کی یاد دلاتے تھے۔ چاروں طرف تیزی سے نظریں دوڑا کر ہیون سانگ نے اندازہ لگایا کہ یہ بنگلہ کم از کم ڈیڑھ ہزار گز کے گھیراؤ میں ضرور ہوگا۔ اُس نے مین گیٹ پر ایک چھوٹی سی سنہری تختی پر لکھا ہوا دیکھ لیا تھا "میر کیشا۔"

بعد میں شاید ہوا بدلی تو نام بھی بدل دیا گیا۔ "آدرش گیسٹ ہاؤس!" برآمدے کے ایک سرخ صوفے پر ہیون سانگ کو بٹھا کر ملازم اندر چلا گیا۔ بل ڈاگ برآمدے میں تیز لہراتی ہوئی لال زبان نکال کر خاموشی سے دوزانو بیٹھ گیا۔ شاید اُسے یقین آگیا کہ نووارد، چور نہیں ہے، بلکہ نیک آدمی ہے۔

نیکی اور چوری میں صرف بال برابر لمحے کا ہی فرق ہوتا ہے۔

صوفے کے سامنے سنہا میکا کی نیلگوں میز پر درجنوں انگریزی زبان کے میگزین پڑے تھے۔ ہیون سانگ انھیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ان میں چند نہایت دلکش قسم کی عریاں تصویریں تھیں۔ ایک میگزین میں پورے صفحے پر آمنے سامنے دو تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ جن پر ایک مشترکہ عنوان جمایا گیا تھا۔

"جسم بولتے ہیں۔"

اور پھر ایک تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا: "کھا جو رہا ہوں میں" — (ہندوستان)

اور دوسری تصویر کے نیچے ــــ" نائٹ کلب میں"ــــ (امریکہ)

اور پھر چند منٹ بعد ہیون سانگ ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ جہاں ایک پروقار قسم کی خاتون کرسی پر یوں تشریف فرما تھیں کہ اوپر کا آدھا دھڑ تو نمایاں تھا اور دلکش۔ اور نچلا دھڑ میز کے نیچے غائب تھا۔ خاتون کے چہرے پر جھریاں تھیں جو دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ خاتون بطور آداب بمشکل تھوڑا سا اوپر اٹھی اور بمشکل مسکرا کر بولی "گڈ آفٹر نون سر!"

ہیون سانگ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "نمسکار کرتا ہوں"

اور پھر اس نے اپنا نام، باپ دادا کا بھی نام اور اپنی سیاحت کی غرض و غایت بتائی۔ تو خاتون بولی "اوہ! تو آپ اس عظیم سیاح ہیون سانگ کے خاندان میں سے ہیں جو ساتویں صدی میں راجہ ہرش کے عہد میں بھارت یاترا پر تشریف لائے تھے۔ میں نے ایم اے تک ہسٹری پڑھی تھی۔ مجھے چینی تہذیب و تمدن سے ایک گونہ کشش ہے۔ بلکہ یوں کہیے، ہماری روح چین میں ہے جسم ہندوستان میں ہے۔ ہمارے گوتم بدھ ہندوستان ہی سے چین میں گئے تھے۔ آپ ہمارے گیسٹ ہاؤس میں گیسٹ بن کر نہیں بھائی بن کر رہیے۔"

ہیون سانگ نے کہا "ہندی چینی بھائی بھائی!"

خاتون کے منہ کا مزا تھوڑا سا کڑوا ہوا مگر پھر تھوڑا ایک تجارتی تبسم اندر سے برآمد ہوا، اور کہنے لگی۔

"اجی چھوڑیئے، وہ پالٹیکس تھا۔ انسانی سماج کی سب سے بڑی غلیظ گیم۔ میں پالٹیکس سے یوں دور رہتی ہوں جیسے خالص دودھ سے پانی۔ میرے ڈیڈی ایک بہت بڑے ریاضی داں تھے۔ یہ بارد کٹیا انھوں نے ہی مجھے جہیز میں دی تھی۔ میں نے سوچا، جہیز بُری رسم ہے، مگر اسے اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کیا جائے تو بُری نہیں رہتی۔ چنانچہ میں نے اسے آدرش گیسٹ ہاؤس میں بدل دیا ۔۔۔ آپ کو کیسا لگا؟"

"کون؟ آپ یا گیسٹ ہاؤس۔؟"

خاتون مسکرادی "دونوں؟"

"دونوں بالکل تانیورسنتے!"

"بن باسی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"بن باسی؟ کیا آپ کے شوہر محترم؟"

"نہیں، بن باسی ایک البیلا نوجوان شاعر ہے۔ آپ کو اُن سے ملاؤں گی۔ بالکل تبت کے دلائی لامہ کے سے نقش و نگار۔"

"اور آپ کے شوہر محترم کا کیا شغل ہے۔"

خاتون کا چہرہ تو تانیورسنتے کے لفظ سے دیپک راگ کی طرح سرخ اور گرم ہوگیا تھا۔ شوہر کے لفظ پر اور بجلی حالت میں آگیا۔ بلکہ جھریاں تک اُبھر آئیں۔ بولی۔

"اُن سے بھی آپ کو کبھی ملاؤں گی۔"

"کبھی کیوں؟"

"کیوں کہ مجھے بھی وہ کبھی کبھی ہی ملتے ہیں۔ وہ بہت بڑے انجنیئر ہیں۔
اچھا چھوڑیئے، یہ قصّے پھر کبھی سہی۔ بلکہ میں نے ایک ناول بھی اس موضوع
پر لکھا ہے۔ اس کا دیباچہ پاسی نے تحریر کیا ہے۔ آپ کو مطالعہ کے
لئے دوں گی۔ آپ فی الحال اپنے کمرے میں قیام فرمایئے، ہر آسائش آپ
کو بغیر پوچھے میسر آئے گی۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ایک کمرہ آج خالی مل گیا۔
ورنہ عام طور پر سارا گیسٹ ہاؤس "فل" رہتا ہے۔ اٹلی سے، جاپان
سے، فرانس سے، ایران سے دنیا کے کونے کونے سے سیاح ہمارے
ہاں آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ سیاہ سُوٹ کے ساتھ سفید نکٹائی لگائے
ایک منیجر قسم کا جنٹلمین اندر آیا۔ خاتون شریھارانی نے اسے آرڈر دیا۔
"انھیں کمرہ نمبر پندرہ میں لے جاؤ، جو ہمارے پائین باغ کی طرف کھلتا ہے
اور جہاں سے بیک وقت جمنا ندی اور قطب مینار دونوں دکھائی دیتے ہیں۔"

جب ہیون سانگ اس کمرے میں داخل ہوا۔ تو اس نے دیکھا، جمنا
ندی سُوکھی ہوئی تھی اور قطب مینار اس بلڈنگ کے پیچھے چھپ گیا تھا جو
مینار سے بھی بلند تھی۔ شاید یہ "بدر کیا" تعمیر ہوئی تھی۔ تو جمنا اور مینار
اپنی اصلی حالت میں ہوں گے۔ ہیون تنگ نے سوچا کہ لگتا ہے، اس کے
بعد دہلی شہر بہت ترقی کر گیا اور کسی چیز کو بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں رہنے دیا گیا۔

ہیون سانگ ابھی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ ایک کلرک نما شخص
ایک رجسٹر سنبھالے اندر داخل ہوا۔ "صاحب! اس پر اپنی انٹری کے دستخط

کر دیجئے ۔"

ہیون سانگ نے دستخط کر دیئے ۔

"اور صاحب! پانچ سو روپیہ ایڈوانس ۔"

"پانچ سو؟ بہت زیادہ ہے؟"

"صاحب! گزشتہ سال تین سو روپے تھا۔ چھ مہینے بعد چار سو کر دیا گیا۔ اس سہ ماہی سے پانچ سو۔"

مہنگائی اسی رفتار سے یہاں بڑھ رہی ہے صاحب!

ہیون سانگ نے روپے ادا کر دیئے۔ مگر جاتے جاتے کلرک سے پوچھا ۔"کیا تمہاری تنخواہ بھی اسی رفتار سے بڑھی ہے ۔"

وہ بولا ۔"ہی ہی ہی؟"

ہیون سانگ نے جواباً کہا۔" ہی ہی ہی!

کلرک بولا ۔"صاحب! آپ تو مجھ سے بہتر ہی ہی کر سکتے ہیں ۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔ اور ہیون سانگ کے ذہن میں بڑی دیر تک وہ ہی ہی ہی، کسی تیکھی نوک کی طرح چبھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو" ہی ہی ہی صاحب! آپ بھی کیا مذاق کرتے ہیں۔ مالکن تو ایک پھل ہے اور میں اُس کا ایک چھلکا۔ چھلکا اور پھل دونوں ایک رفتار سے کیسے ہنس سکتے ہیں۔

کتنا جمع بیٹا نفی ماں

آنے والے چند دن آدرش گیسٹ ہاؤس میں ہیون سانگ پر بڑے ل

گزر گئے جیسے اس کے در و دیوار، دو دونی چار کا پہاڑہ پڑھتے جا رہے ہوں۔ یہ زر و سیم کے لین دین کی دنیا تھی۔ یہاں کا ہر رشتہ پیسے کا تھا۔ پیسہ ادا کرو، سلام، احترام وصول کرو۔ پیسہ نہ دینے سے کتی کتراؤ۔ وہاں کا ہر ذی روح آپ کے پہلو سے یوں گزر جائے گا۔ جیسے کوئی کار، بائیسکل کے پہلو سے دھول اڑاتی ہوئی گزر جائے۔

یوں لگتا تھا وہاں کا ہر فرد الگ الگ زندگی گزار رہا ہے اور اسی لئے خوش بھی ہے۔ خوشی کی یہ تنہائی ہیون سانگ کو عجیب بھی لگی اور دلچسپ بھی۔ بلکہ ایک مرتبہ مسٹرین باسی نے اُسے ایک غزل سُنائی جس کا ایک شعر اُسے بہت تیکھا لگا۔ کہ ے

مُردے ایک دوسرے سے کب خوش ہیں
اپنی اپنی ہے قبر، سب خوش ہیں

اور کبھی کبھی ہیون سانگ کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ گیسٹ ہاؤس ایک ہزار گز تک پھیلا ہوا بہت بڑا قبرستان ہے۔ جس میں ہر زندہ انسان اپنی قبر میں بیٹھا چاندی کے کسی سکے کی طرح جھنکارے جا رہا ہے اور گائے جا رہا ہے۔

کبیرا کھڑا بازار میں سب کی مانگے خیر
ناہیں کسی سے دوستی، ناہیں کسی سے بیر

کبیر کے دوہے میں صرف اتنی سی ترمیم کی گئی تھی کہ ہر ایک اپنی اپنی خیر منائے جا رہا تھا۔ مگر ظاہر یہ کرتا تھا، دوسروں کی خیر منائے جا رہا ہے۔ ہر ایک

کی خیر مانگی جائے تو اپنی خیر آٹومیٹک ہو جاتی ہے۔

مگر مسٹر بن باسی کا دل آسے سب سے زیادہ پرکشش لگا۔ وہ نا ٹے قد کا مگر بھرے بھرے بدن کا گورا چٹا، ایک رسیلا اور البیلا نوجوان تھا۔ وہ کھدر کا کرتا اور سفید لباس زیب تن کئے رکھتا۔ باتیں کرتا تو پھول جھڑتے تھے، اگرچہ وہ اتنی کم باتیں کرتا تھا کہ شوبھا اپنی پھول جھڑنے کے ترنم سے اکثر محروم رہتی تھی۔ لیکن چند دن کے قیام کے بعد ہیون سانگ کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اس البیلے آرٹسٹ جوان کو اپنا عاشق بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بن باسی اپنے رنگ ڈھنگ سے عاشق کم اور معشوق زیادہ لگتا ہے۔

ایک دن ہیون سانگ نے بے تکلفی میں اس سے پوچھا: مسٹر بن باسی! کیا آپ نے شادی نہیں کی۔

وہ معصوم بچوں کی طرح ہنسا اور بولا۔ "مسٹر ہیون سانگ! کوئی لڑکی ہم سے عشق ہی نہیں کرتی۔"

"ممکن ہے کسی کو جرأت ہی نہ ہوتی ہو۔"

"جرأت نہیں صاحب! سمجھ کی قلت ہے۔ کبھی کبھی میرے اندر کا شاعر کہہ اٹھتا ہے، بھاگ جاؤ اس ملک سے۔ جو ابھی بلکہ کبھی بھی نہیں سمجھے گا۔ مسٹر ہیون سانگ! کیا کریں، آتما بے چین ہے۔"

"اور آپ کی شاعری کئی حسیناؤں کو بے چین کئے رہتی ہے۔"

"ایک کا نام ہی آپ بتا دیجئے۔"

"بتاؤں گا تو آپ مانیں گے نہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے، شوبھا رانی جی! مگر.....؟" اس نے حلق سے ایک ٹھنڈی آہ نکالنے کی کوشش کی۔ مگر پھر وہ حلق میں ہی اٹک گئی، اور بولا۔

"آپ شوبھا رانی جی کو نہیں جانتے۔ وہ مجھ پر بڑی مہربان ہیں۔ مجھے وہ ذرّے سے آفتاب بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن..... لیکن.... وہ خود غم کے اندھیرے میں غوطے کھا رہی ہیں۔ غوطے تو میں بھی کھا رہا ہوں۔ مگر دونوں کے غوطوں میں بڑا فرق ہے۔ میرا تو کئی بار جی چاہا، انھیں بچاتے بچاتے خود ڈوب جاؤں۔ لیکن یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی چھوٹی ندی، ڈ شال سمندر کو بچانے کی حماقت کرے۔ وہ لاکھوں کی مالک ہیں اور میں ایک مفلس خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ......"

ہیون سانگ کو لگا، بن باسی کے اندر کا غم جو اب تک تنہا تھا، ہیون سانگ کے لمس سے ہجوم بن گیا ہے۔ اُسے ہیون سانگ میں ایک آرٹسٹ کا دل، ایک سنیاسی کی رُوح اور ایک فلاسفر کا ذہن نظر آیا۔ چند دنوں کی صحبت میں وہ ہیون سانگ پر کھُل گیا تھا — ایک مرتبہ ہیون سانگ نے پوچھا۔

"بن باسی! وہ تم سے عشق کرتی ہے۔ کیونکہ وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہو گئی ہے اور تم صرف اس کا غم کھاتے ہو۔ کیا تم اس غم کو عشق میں نہیں بدل سکتے۔"

"اس پیسے کی دُنیا میں غم بھی غنیمت ہے مسٹر ہیون سانگ! عشق تو اس دنیا میں ایک غیر ضروری خواب بن کر رہ گیا ہے۔ آئیے، میں آپ کو شوبھا

رانی جی سے ملاؤں - میں اُدھر ہی جا رہا ہوں - وہ کل سے علیل ہیں - بستر پر دراز ہیں؟"

وہ دونوں اُس کی خوابگاہ میں چلے گئے۔ شوبھا رانی کی غلافی آنکھوں میں زردی کا غبار تھا۔ بن باسی کو دیکھتے ہی اس کی زردی میں ایک گلابی پن سا آگیا۔ وہ مسکرائی، آغوش پھیلی، مگر ہیون سانگ کو ہمراہ دیکھ کر آغوش سمٹ گئی۔ بولی۔ "آؤ بن باسی! تم کہاں چلے گئے تھے۔"

"آپ کے لئے مارکیٹ سے لیموں لانے کے لئے گیا تھا۔"

"کسی نوکر سے کہہ دیتے۔"

"آپ کے نوکر اور میرے لیموں میں کوئی فرق نہیں ہے کیا؟"

اپنی ہی بات پر بن باسی کھل کھلا کر ہنسا۔ وہ جب کھل کھلاتا تھا تو یوں لگتا تھا۔ اپنے سراپا کو ننگا کر رہا ہے۔ بڑا معصوم اور بے محل قہقہہ ہوتا تھا اُس کا۔ اس قہقہے پر شوبھا رانی کی زردی بھی کھل کھلا اٹھی۔ گلاب سا بن گئی۔ مگر یوں جیسے کسی لاش پر گلابی کفن ڈال دیا جائے اور لاش قابل قبول ہو جائے۔

"کیا ڈاکٹر آیا تھا؟ میں نے اُسے کلینک سے روانہ کر دیا تھا۔"

"آیا تھا۔ ایک سندر ویہوار ٹرننگ فیس لے گیا ہے، تسلی دے گیا ہے۔"

اور پھر اُس نے ہیون سانگ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ کو ہماری نرملی کیسی لگی؟"

ہیون سانگ بولا۔ "تسلی بخش بالکل ڈائننگ فیس کی طرح؟"

بن باسی ہنس پڑا۔ بن باسی کو ہنستے دیکھ کر شوبھا رانی بھی ہنس دی جیسے ہنسی

کے لیے وہ دوسرے کی محتاج تھی۔ لاکھوں کی مالک اور یہ محتاجی اور پیاس۔
اتنے میں شوبھا رانی کا لڑکا اور لڑکی، قریب قریب ہیش قیمت لباس میں ملبوس، جھومتے، ناچتے، تیز تیز پاؤں پٹختے کمرے میں داخل ہوئے۔ دوسرے دروازے سے سانولے رنگ کی دو نوجوان گورنسیں ان کی طرف لپکیں۔
انھوں نے بچوں کے بستے سنبھالے، ان کی پیشانیوں پر بوسے ثبت کیے اور بولیں۔ "چلئے چھوٹے چھوٹی حضور! لنچ آپ کا منتظر ہے۔"
شوبھا رانی نے ان دونوں کی طرف باہیں پھیلائیں "ہیلو! پنکی اور ٹونی! ہاؤ آر یو؟"
گورنس بولی۔ "لنچ چھوٹے حضور!"
چھوٹے حضور نے پیر پٹخ کر کہا۔ "ڈونٹ ان سینس۔ چوکیدار نے ہمیں ابھی بتایا کہ ہمارا کتا پپی بیمار ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"
بن باسی بول اٹھا۔ "ٹونی! تمہاری ممی بھی بیمار ہے۔"
"ممی کے لئے تو ڈاکٹر گھوش آجائیں گے۔ مگر ہمارے پپی کے لیے کسی نے ڈاکٹر کو بلایا؟"
"فون کر دیا ہے بیٹا! تم ذرا میرے پاس آؤ۔"
"نو نو! میں خود ڈاکٹر بنسل کو ٹیلی فون کرتا ہوں...... کمال ہے، کسی کو ہمارے پپی کی پرواہی نہیں۔ چلو پنکی! پپی کو دیکھ آئیں۔"
"مگر چھوٹے حضور لنچ؟"
"نہیں پہلے پپی لنچ اس کے بعد۔"

"ہاں!" پنکی نے اپنی بوبڈ زلفیں جھنجھوڑ کر کہا۔ "یہ بچی بیٹھ نہیں کرے گا۔ تو ہم بھی نہیں کریں گے۔"

اور یہ کہہ کر وہ اپنے بوٹوں سے منقش نفیس، گلگلے قالین پر چاند ماری سی کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور جیسے ماتم گساروں کی سی حسرت کے ساتھ بن باسی کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔ "مگر بیٹے! پہلے ممی، پھر پپی، پھر پنکی۔"

اور ممی کی آنکھوں سے جو آنسو نکلے انھوں نے گلاب کو پھر زرد بنا دیا۔ اس کی اٹھی ہوئی باہیں یوں بستر پر جا گریں جیسے اُن میں جان نہ رہی ہو، جیسے انھیں فالج ہو گیا ہو۔ بن باسی نے ہیون سانگ کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو "دیکھا اسے چینی سیاح؟ زر و سیم کی اس دنیا میں کتنے تم ہیں جنہیں ہر فرد تنہا تنہا کھیل رہا ہے۔ ایسے میں تم عشق کی باتیں کرتے ہو۔"

شوبھا رانی کی آنکھیں مُند گئیں۔ دو چار منٹ تک مُندی رہیں۔ اندر سے ماحول میں سائیں سائیں کرتی ہوئی بے بسی اور پھر آنکھیں موندے موندے شوبھا رانی کے منہ سے نکلا۔ "بن باسی!"

"سُن رہا ہوں۔"

"وہ بھگوتی جاگرن کرنے والے آئے تھے۔ منیجر سے کہہ کر انھیں پانچ ہزار روپے دلوا دو۔ بھگوتی جاگرن آج رات کو ہی ہو جانا چاہیے۔"

"مگر وہ خالص فراڈ ہیں ——" "آپ ہی نے کہا تھا۔"

"فراڈ میں ہی شاید مجھے چند لمحوں کی شانتی مل جائے۔"

"جیسے آپ کا حکم"

"حکم نہیں، شانتی ۔"

اور پھر بن باسی کی بے چین آتما، شانتی کی کھوج میں کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہیون سانگ بھی ــــ اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ وہ نہ صرف اس کمرے میں سے بلکہ گیسٹ ہاؤس سے بھی بھاگ جائے گا۔

تقدیر کے اسمگلر

اور ہیون سانگ اپنے سیاحت نامے کے ایک باب میں لکھتا ہے:۔

ہندوستان کے باشندے تقدیر کی مجبوری پر یقین رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو یورپ اور امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹتے ہیں۔ انھیں بھی میں نے یہی کہتے سنا ہے۔ "صاحب! ہمارے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ کہ ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔"

میں نے ایک مرتبہ ہندوستان سرکار کے ایک ڈپٹی سکریٹری سے پوچھا۔ "جناب! وہ رامو جو آپ کے جھوٹے برتن مانجھنے کے لئے آتا ہے ایک جھگی میں کیوں رہتا ہے؟"

وہ بولے۔ "اس کا نصیب!"

"مگر سنا ہے۔ وہ کل آپ کی کوٹھی سے آپ کی بیگم کے زیورات چرا کر لے گیا۔"

"یہ ہمارا نصیب!"

غرض ہندوستان کا ہر باشندہ صرف اس لئے زندہ ہے کیونکہ، زندہ رہنا اُس کی قسمت میں لکھا ہے۔ اور بس لوٹتا ہے ـــــ لوٹنا اس کی قسمت۔

مرغی انڈا دیتی ہے ـــــ مرغی کی قسمت۔

انڈا ٹوٹ جاتا ہے ـــــ کھانے والے کی قسمت۔

لیڈر پر گندے انڈے پھینکے جاتے ہیں ـــــ لیڈر کی قسمت۔

غریب کو گندے انڈے بھی کھانے کو نہیں ملتے ـــــ گندے انڈوں کی قسمت۔

قسمت کی اسی تھیوری سے ہندوستانیوں کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ...... مجھے ایک بہت بڑے میڈیکل کالج کے کالج سے بھی بڑے پروفیسر ڈاکٹر نے بتایا کہ میری بیوی پر بار بار اعصابی حملے ہوتے تھے۔ میں نے اُس پر اپنی میڈیکل سائنس استعمال کی، وہ تمام کیپسول اور انجکشن اس کے اندر انڈیل دیئے، جو گمراہ اعصاب کو راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ کالج میں میڈیکل اسٹوڈنٹس کو اُن کیپسولوں اور انجکشنوں کے جادو پر لیکچر دیتا تھا مگر گھر آکر جب اپنی بیوی کی دردناک حالت دیکھتا تو تکیئے میں منہ چھپا کر رونے لگتا تھا کہ میرا لیکچر جھوٹ کا پلندہ تھا۔ اچانک ایک دن ایک ننگے سادھو نے ہمارے گھر پر آکر الکھ جگائی۔ اور باتوں باتوں میں اُس نے کہا۔ "بیٹا! تیری بیوی کے بھاگیہ کا لکھا ہوا پورا ہو رہا ہے۔ لہٰذا غم نہ کھا ذرا درموج سے رہو۔"

اور جونہی میری بیوی کو معلوم ہوا کہ یہ اس کا مرض نہیں ہے بلکہ تقدیر ہے تو پھر جناب! ایک معجزہ ہوا۔ اس کا اعصابی تناؤ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا، ہوتا گیا، ہوتا گیا۔ اور پھر ایک دن اسے مکمل افاقہ ہو گیا۔ تقدیر کا انجکشن سب انجکشنوں سے موثر نکلا۔ میرا خیال ہے، انسان اگر اپنی ساری تناتنی تقدیر کے حوالے کر دے تو وہ بڑا شانت ہو جاتا ہے، نارمل انسان بن جاتا ہے۔

"میں نے پوچھا۔" آج کل آپ کی بیوی کیسی ہے۔"

"پہلے سے زیادہ حسین نکل آئی ہے۔"

"اس حسن کے متعلق اس کا کیا خیال ہے۔"

"کہ یہ بھی میری تقدیر کا حسن ہے میرا نہیں۔"

"کیا آپ آج بھی کالج میں لیکچر دیتے ہیں۔"

"ہاں!"

"یقین نہیں رکھتے مگر پھر بھی دیتے ہیں۔"

"کیا کروں جی میری تقدیر میں یہی لکھا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کرنے کے فیض سے ہندوستانی باشندوں کی صحت پر بھی بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ چونکہ اعصابی کشمکش پیدا نہیں ہوتی اس لئے خاصی طویل عمر پاتے ہیں۔ ان کا وزیر اعظم پچاسی برس کے پیٹے میں تھا۔ حالانکہ اسے بار بار کہا گیا کہ قبلہ! آپ بن باس پر چلے جائیے اور خدا کی عبادت کیجئے مگر وہ کہا کرتا تھا۔ میں خدا کی تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں اس نے میری قسمت

میں وزارت عظمیٰ لکھ دی ہے، بن باس نہیں۔

اور نوشتۂ تقدیر کو بڑے سے بڑا پولیٹکل نظریہ بھی نہیں مٹا سکتا۔

اگرچہ میں نے ہندوستان میں یہ بھی دیکھا کہ دس ماہ کا معصوم سا بچہ، تنگ و تاریک جھونپڑی کی گھٹن میں انتقال کر جاتا ہے، بائیس برس کی نوبیاہتا لڑکی، مٹی کے تیل میں جل کر خاک سیاہ ہو جاتی تھی۔ وہ بچہ جس نے اسکول میں ابھی اپنا نام بھی صحیح طور پر لکھنا نہیں سیکھا ہوتا، کسی تیز رفتار ٹرک کی زد میں آکر ہلاک ہو جاتا تھا۔ لیکن ہندوستانیوں کا وشواس تھا کہ یہ سب ان کے پچھلے کرموں کا کھیل تھا، قسمت میں جو کھیل لکھا ہے وہی اسے بھوگنا پڑے گا۔

بہرکیف نصیب کی یہ تصویر بڑی پُراسرار چیز تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر سب کی سمجھ کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ وہ خدا کی طرح ہر جگہ موجود تھی مگر نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تقدیر کا رول بڑا مضحکہ خیز بھی لگتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے ایک سرمایہ دار سیٹھ نے بتایا کہ کل ایک اسمگلر، پولیس کے مقابلے میں مارا گیا۔ اس کی تقدیر میں ایسی ہی موت لکھی تھی۔

میں نے کہا۔ "مگر سنا ہے، اسی مقابلے میں ایک پولیس افسر بھی مارا گیا۔ آخر کیوں؟ وہ تو اسمگلر نہیں تھا۔"

"اجی، تقدیر یہ نہیں دیکھتی کہ کون اسمگلر ہے اور کون پولیس افسر۔ اس کے پاس تو ایک فہرست ہوتی ہے۔ جس کی باری آئی، وہی چاروں شانے چت۔ مثلاً یہی دیکھئے، بمبئی کا ایک نامی گرامی اسمگلر ہے مگر نہ

وہ گرفتار ہوتا ہے، نہ ہلاک کیا جاتا ہے۔ اخباروں میں فلم ایکٹرسوں اور لیڈروں دونوں کے ساتھ فوٹو کھنچواتا ہے مگر اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

میں نے حیرت سے کہا "ہو سکتا ہے وہ ان لیڈروں کا داشتہ ہو۔"
"اجی نہیں لیڈروں کا داشتہ ہونا بھی تقدیر کا کھیل ہے۔ ایک اسمگلر پولیس کے مقابلے میں مارا جاتا ہے، دوسرا پولیس کی چھاتی پر مونگ دلتا ہے دندناتا پھرتا ہے۔"
"وہ کب تک مارا جائے گا۔"
"جب کبھی نصیب میں اس کی باری آئی، تو وہ بندوق سے نہیں، ایک چیونٹی کے ہاتھوں بھی مارا جائے گا۔ چیونٹی ہاتھی کو بھی مار دیتی ہے، اسمگلر کو بھی۔"
سامعین کرام! اس سرمایہ دار سیٹھ کی چار کوٹھیاں تھیں۔ پانچ فیکٹریاں تھیں، دو بیویاں اور تین داشتائیں تھیں اور یہ سب بھگوان کی لیلا تھی۔ بھگوان، جو ساتویں آسمان کے اوپر بیٹھا، انسانوں کی تقدیریں لکھتا رہتا ہے اور صدیوں سے لکھتے لکھتے نہیں اکتایا۔

سہن شکتی کا دیو

اور اسی باب میں آگے چل کر بیدن سانگ رقم طراز ہے :-
ہندوستان میں ایک فلاسفر قسم کا شاعر گزرا ہے۔ جس کا نام

اقبال تھا۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور اس کا ایک حصّہ کاٹ کر اُسے پاکستان کا نام دیا گیا۔ تو شاعر اقبال بھی تقسیم کر دیا گیا۔ اور کچھ یوں کہ ہندوستانی اسے اپنا شاعر کہتے تھے اور پاکستانی اپنا۔ بلکہ اس مسئلہ پر دونوں ممالک میں تین جنگیں بھی ہوئیں۔ مگر آخر ہزاروں با شندوں سے کھیت کرنے کے بعد دونوں ملک اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین تقسیم ہو سکتی ہے، شاعری تقسیم نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے لئے وہاں ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کا رواج تھا اور اس رواج کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بہر کیف اسی شاعر اقبال نے ایک بار ہندوستانی (اور پاکستانی بھی) معاشرے پر ایک شعر لکھ دیا تھا جو بعد میں شاعری طرح لافانی کہلایا کہ ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ایک مرتبہ میں نے دہلی یونیورسٹی کے ایک دانشور سے پوچھا۔
"اے دانشور! شاعر اقبال کے ذہن میں وہ کونسی بات تھی جس کے سبب ہندوستانی سوسائٹی کی ہستی ابھی تک مٹنے میں نہیں آئی۔"

وہ بولا "یہیں شکتی! ہماری سوسائٹی کی گھٹی میں قوتِ برداشت اتنی ہے کہ ہم بڑے سے بڑے سانحے کو بھی شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتے ہیں۔"

میں یہاں اطلاعاً عرض کر دوں کہ اس دانشور کی بیوی نہایت حسین تھی۔ اس لئے وہ امریکہ بھاگ گئی تھی۔ بیوی کے اس فرار کو وہ دانشور بھی شہد کا

گھونٹ سمجھ کر پی گیا تھا۔

اور اطلاع نمبر دو عرض ہے کہ وہ دانشور عقل کا حسین مگر نقش و نگار کا بھونڈا تھا۔ اور آج کل ایک خاتون لیکچرار اس سے عشق فرما رہی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دانشور انتہائی بھونڈا ہے۔

خاتون لیکچرار کی سہن سکتی کی حد ہے۔

سہن سکتی کی یہی وہ دولت ہے جس سے پوری ہندوستانی قوم مالا مال ہے۔ ساتویں صدی میں جب میرے خاندان کا ایک بزرگ سیاح ہیون سانگ ہندوستان میں آیا تھا تو اس وقت آپ سڑک پر سونے کی ڈلیاں اچھالتے چلے جائیں کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کہ اسے پاک باطنی سمجھا جاتا تھا ــــ حرص و ہوا سے مبرا ایک معاشرہ۔

اور آج بیسویں صدی میں اگرچہ سونے کی ڈلیاں سڑک پر نہیں پھینکی جاتیں کیونکہ سونا ہی نہیں بلکہ ہر چیز اتنی مہنگی ہو گئی ہے کوئی آدمی گلا سڑا آم بھی سڑک پر نہیں پھینکتا۔ کیونکہ پھینکنے کی نسبت یہ بہتر سمجھا جاتا ہے کہ اسے ان کے گھر کا کوئی بچہ ہی کھا لے گا ــــ لیکن اس کے باوجود یہ معاشرہ آج بھی حرص و ہوا سے مبرا ہے۔ اگر کوئی سونا اسمگل کر کے کسٹم چوکی سے گزر جائے۔ تو کوئی کسٹم افسر اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

بعض بد طینت لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس لئے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے کہ کہیں وہ اسمگلر کسی وزیر کا بیٹا نہ ہو۔ مگر ایسے بد طینت لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ اور سماج انھیں یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے کہ یہ لوگ

مغرب زدہ ہیں ہندوستانی تہذیب کی روح کو نہیں سمجھتے (ایسے لوگ عام طور پر خودکشی کر لیتے ہیں یا کتوں کی موت مرتے ہیں۔)

بہرکیف ہندوستانی تہذیب کی روح، سہن شکتی کے دیو کے اندر بند رہتی ہے۔ اگر کوئی سونا اسمگل کرتا ہے تو بھی اُسے برداشت کر جاتے ہیں۔ بلکہ اگر اس کا باپ کسی محکمہ کا وزیر ہے تو اُس وزیر تک کو برداشت کر جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ وزیر دسویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ چند برس پہلے جو آدمی بائیسکل پر سوار ہو کر دیواروں پر پوسٹر چپکاتا تھا۔ وہ وزیر بن کر ایمبیسڈر کار میں گھومتا ہے اور سوسائٹی اسے برداشت کرتی ہے۔ وہ آدمی بائیسکل کو برداشت کرتا تھا، سوسائٹی اُس کی کار کو برداشت کرتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ ہر تغیر، فطرت کا تقاضہ ہے اور کہ ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہی سبب ہے کہ اہلِ ہندوستان اپنے آپ کو ایک آزاد معاشرہ کہتے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر چور کو یہ آزادی ہے کہ وہ چوری کرے تو مکان مالک کو بھی آزادی ہے کہ وہ چور کو پکڑ سکتا ہے تو پکڑ لے۔ نہیں پکڑ سکتا تو سہن شکتی سے کام لے۔ ہندوستان کے آزاد معاشرے کو یہ علم ہے کہ یہاں سفلہ صفت انسان بھی رہتے ہیں۔ جو اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو ایک عمارتی ٹھیکے دار کو دیکھا، وہ تعمیر مکان میں کام آنے والی ریت میں ملاوٹ کرتا تھا۔ لیکن

ملاوٹی ریت، کو بھی اس لئے برداشت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ریت پر اس کا اجارہ ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو اجارہ داری کو برداشت کر دیا بے مکان رہنا برداشت کرو کہ رات کو کھلے آسمان کے نیچے سونے کے لئے فٹ پاتھ موجود ہیں۔

چنانچہ شہر دہلی میں ہر روز ہزاروں اشخاص فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور ذرا بھی مائنڈ نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں سے کئی ایک تو صبح فٹ پاتھ سے اٹھ کر عبادت گاہ میں بھی چلے جاتے ہیں۔ اور خدا کا شکرانہ ادا کرتے ہیں جس نے انھیں انسان کا ہیرا جنم دیا اور فٹ پاتھ پر سلایا۔

اس قوتِ برداشت سے لدے پھندے آزاد معاشرے میں تین قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صبح کوڑے کرکٹ سے بھرے ہوئے ڈرل کو ٹٹول ٹٹول کر اس میں سے وہ چھوڑے ہوئے لقمے اور ہڈیاں تلاش کرتے ہیں۔ جنھیں رات کو کچھ کھاتے پیتے آدمی لطور رتے اس ڈرل میں انڈیل دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو — بس دوسرے وہی جو اپنے شکم سے ایکسٹرا مواد باہر نکال دیتے ہیں اور یہ سوچ کر باہر نکال دیتے ہیں کہ صبح حاجت مندوں کے کام آئے گا۔

اور تیسری قسم کے باشندے وہ ہوتے ہیں۔ جو تھے کے مناظر اور کوڑے کرکٹ کے ڈرل میں ٹٹولنے کے مناظر کے فوٹو کھینچتے ہیں، ہائے توبہ مچاتے ہیں، آتشیں تقریر کرتے ہیں، اور پھانسی پر جھول جانے کے اعلانات کرتے ہیں —— یہ باغی، انقلابی، احتجاجی اور جہادی

وغیرہ کھلاتے ہیں۔ اور پھر جب شور مچا مچا کر ان کے گلے سوکھنے لگتے ہیں، دم ٹوٹنے لگتے ہیں۔ تو بھاگ کر اہل زر کی چھتر چھایا میں چلے جاتے ہیں۔ اور مرغ و ماہی کے شوربے میں اپنے انقلاب، بغاوت، احتجاج اور جہاد کو غرق کر دیتے ہیں۔ اور اپنی اس غرقابی کو یہ کہہ کر برداشت کر لیتے ہیں کہ یہ دھرتی، انقلاب کے لئے موزوں نہیں ہے۔ بلکہ شوربے کے لئے موزوں ہے اور مرغ و ماہی کے مالک بھی ان انقلابیوں کو یہ کہہ کر برداشت کر لیتے ہیں کہ ع

"کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری"

اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے چھوڑی ہوئی ہڈیاں ڈھونڈنے والے لوگ بھی، ان انقلابیوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیتے ہیں کہ ان انقلابی مجاہدوں کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو ہمارے اندر خودی کو بلند کرتے رہے، کانی دیرینگ کرتے رہے۔ یہ ہم ہی ہیں کہ ڈھیل کے چھوڑے ہوئے لقموں کی لذت کا شکار رہے، نئی لذتوں سے آگاہ نہیں ہو سکے۔ اور سے

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

اور قوت برداشت کی یہی وہ لافانی روح ہے۔ جو ہندوستانی معاشرے کو صدیوں سے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ایکسپلائٹ کرنے والے، ایکسپلائٹ ہونے والے اور ایکسپلائٹیشن پر شور مچانے والے۔۔۔

تینوں، ایک دوسرے کو برداشت کئے جا رہے ہیں فقط کبھی کبھی قوتِ برداشت کے اس وشال ساگر میں چھوٹے چھوٹے بلبلے سے اٹھتے ہیں جنہیں کوئی بغاوت اور کوئی آزاد معاشرہ کہہ کر من بہلا لیتا ہے۔

راستے مختلف ہیں منزل ایک

اور ہیون سانگ اس باب کے آخر میں لکھتا ہے :-

ایک مرتبہ مجھے ایک بنگلے میں ڈنر کی دعوت دی گئی۔ اس فیملی میں پانچ افراد تھے۔ جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بڑے میاں دھارمک وچاروں کے مالک تھے، سالن میں پیاز تک کی شمولیت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُن کی بیگم گاندھی واد میں یقین رکھتی تھیں۔ اور ہندوستان میں ایک ایسا سماج پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ جس میں اگر بیوی کو بھی ماں کہنا پڑے تو اس پر کوئی بُرا نہ مانے کہ بیوی اور ماں دونوں کے باطن میں بھارت کے سچے کارے گو بجتے ہیں۔

میں نے اُن کی بڑی لڑکی سے پوچھا "اور ان سچے کاروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ گردن بلند کر کے اور ناک سکوڑ کر بولی "یہ نان سینس ہے، جب تک یہ بنگلے اور محل، مفلس کا لہو پی رہے ہیں ایسے سچے کارے ایک بہت بڑی مکاری ہیں۔ میرے ڈیڈی، ممی کے نظریات دراصل ایسے ہی مکاری کی بنیادوں پر تعمیر کئے ہوئے اونچے محل ہیں اور دیکھ لیجئے گا، ہم ایک دن ان محلوں کو ڈھا دیں گے۔"

اور پھر وہی بڑی لڑکی انتہا پسند قسم کے نقش و نگار والی پرشباب لڑکی اپنے ہی بنگلہ نما محل میں سے صبح، انڈے، پھل اور مکھن سے ناشتہ کر کے نکلتی، گیروے رنگ کا کھدری لباس زیب تن کئے، ایک نارنجی جھولا بغل سے لٹکائے، سیدھی مزدور بستیوں کی طرف نکل جاتی۔ اور اُس بستی کی کسی گرتی پڑتی دیوار پر کھڑی ہو کر، مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگاتی۔

"انقلاب زندہ باد!"

"بولو! ہم کیا کریں گے"

"یہ محل ماڑیاں ڈھا دیں گے۔"

اُن کا ایک نوجوان بیٹا تھا۔ جو کمیونزم کی بجائے سوشلزم میں یقین رکھتا تھا۔ میں نے اُس دعوت میں اُس سے پوچھا۔ "تمہارے سوشلزم کا کیا مطلب ہے۔"

وہ مرغ کی ایک ٹانگ کو مینگ کی دال میں ڈبو ڈبو کر کھاتے کھاتے بولا۔ "بیچ بیچ! بیچ بیچ! ارتھات درمیانی راستہ۔ نہ پیار سے نفرت نہ گوشت سے پرہیز۔ ہندوستان کا مستقبل درمیانے ہاتھوں میں ہے۔"

تیسری لڑکی چنچل تھی، پاؤں پٹختی تھی کہتی تھی، "میں انارکسٹ ہوں پورے ڈھانچے کو جڑ سے اکھیڑا جائے گا۔ مستقبل جبھی روشن ہوگا جبھی نظر آئے گا میرے گھر میں سب اندھے بستے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ہی نہیں" سوچ میں بھی تاریکی ہے، عمل میں بھی۔"

اور ہیون سانگ لکھتا ہے ـــــ

میں ہندوستانی تمدن کے طلسم کا قائل ہوگیا۔ کیونکہ یہ ہوش رُبا تھا۔ اُس فیملی کے سبھی افراد اپنی اپنی "میں" کے ساتھ ایک "ہم" بن کر ایک ساتھ رہتے تھے، راستے مختلف تھے، منزل ایک تھی۔ یعنی بنگلے کے اندر انڈے بھی، مکھن سے ناشتہ ــــ یہ ناشتہ کیا تھا۔ بالکل نیشنل انٹگریشن لگتا تھا۔

چلو انڈیا گیٹ!

ہیون سانگ، دہلی کی کناٹ پلیس کی ایک آہنی ریلنگ کے ساتھ پشت لگائے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک نوجوان اس کے قریب آیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "کیوں مسٹر! یہ انڈیا گیٹ کدھر ہے۔؟"
نوجوان پتلے بدن اور ٹھگنے قد کا مالک تھا۔ شاید دیدۂ بینا پیدا کرنے کے لئے اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ اور نجانے عینک لگانے سے اس میں دیدۂ بینا پیدا ہوا تھا یا نہیں، مگر عینک سے اُس کے عالمِ شباب میں بزرگی کی علامتیں ضرور پیدا ہوگئی تھیں۔
ہائے آہ! اس بزرگ کو اتنا بھی علم نہیں تھا کہ انڈیا گیٹ کدھر ہے؟
ہیون سانگ نے اس سے پوچھا "بزرگوار! کیا آپ دہلی کے باشندے ہیں؟"
"جی نہیں۔ میں ہوشیار پور صوبہ پنجاب سے آیا ہوں۔"
"دہلی میں کن صاحب کے ہاں قیام ہے؟"
"اپنے ایک دوست کے یہاں رہتا ہوں انڈیا گیٹ کے

قریب، ایک کوٹھی کے گیراج میں اُن کا گھر ہے۔ میں راستہ بھول گیا۔ اسی لئے انڈیا گیٹ پوچھ رہا تھا۔"

"آپ کا دوست یہاں کیا کام کرتا ہے۔؟"

"ایم، اے پاس کر رکھا ہے، پرائمری سکول کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ مجھے بھی اُس نے خط لکھ کر یہاں بلا لیا تھا کہ یہاں روزگار کے بڑے سنہری مواقع ہیں۔"

"کیا وہ دہلی کا باشندہ ہے؟"

"جی نہیں وہ بھی ہوشیار پور سے آیا ہے۔ مگر آپ مجھے انتم شلوک باتوں میں کیوں الجھا رہے ہیں، بتاتے کیوں نہیں کہ انڈیا گیٹ کدھر ہے؟"

ہیون سانگ نے اس سے دست بستہ معذرت طلب کی اور کہا "معاف کیجئے، میں خود یہاں اجنبی ہوں۔ کسی دہلی کے باشندے سے معلوم کر لیجئے۔ وہ آپ کو انڈیا گیٹ کا راستہ ضرور بتا دے گا۔"

بزرگ نما نوجوان بڑبڑاتا ہوا، شاید گالیاں سی دیتا ہوا چلا گیا۔ ہیون سانگ کو اس کے صرف یہ الفاظ سنائی دیئے "سالے! انجانے کہاں کہاں سے دہلی میں آجاتے ہیں، دہلی کا جغرافیہ تک نہیں جانتے، خواہ مخواہ دوسروں کا قیمتی وقت برباد کرتے ہیں۔"

ہیون سانگ کا جی چاہا۔ اُسے واپس بلا کر کہہ دے۔ "برخوردار! تمہارا وقت صرف تب قیمتی ہوگا جب تمہیں کوئی روزگار مل جائے گا۔

فی الحال تو تم بھی اپنا وقت برباد ہی کر رہے ہو۔

لیکن اُس نے اُسے واپس نہیں بُلایا۔ جو آدمی ترقی کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہو۔ چاہے یہ منزل موٹر گیراج ہی کیوں نہ ہو، اسے روکنا نہیں چاہیے۔

چند منٹ تک وہ پھر اُسی آہنی ریلنگ کے سامنے گزرتے ہوئے نظارے دیکھتا رہا۔ ہر آدمی تیز رفتار تھا۔ جیسے ہر آدمی اپنی کسی نہ کسی گیراج کی طرف جا رہا تھا۔ ہر ایک کا وقت بے حد قیمتی تھا۔ اتنے میں پانچ چھ آدمی، کندھے پر لال پیلے جھنڈے لگائے، اُس کے قریب آ گئے، اور پوچھنے لگے "کیوں بھائی صاحب! یہاں سے انڈیا گیٹ کتنی دُور ہے ؟"

ہیون سانگ نے پوچھا "کیا آپ بھی ہوشیار پور سے آئے ہیں؟

ان میں سے ایک بولا "جی نہیں ہم غازی پور صوبہ یو۔ پی سے آئے ہیں۔ انڈیا گیٹ پر ایک بہت بھاری کسان سمیلن ہو رہا ہے نا؟ ہم کسان ہیں، اُس میں شمولیت کے لیے آئے ہیں۔ وہاں اپنے ایک بہت بڑے نیتا کا بھاشن سنیں گے۔"

"وہ بڑا نیتا کہاں سے آیا ہے؟"

"لکھنؤ صوبہ یو۔ پی سے۔"

"کیا وہ دہلی میں قیام فرماتا ہے؟"

"جی، اب تو وہ دہلی ہی میں مستقلاً قیام فرمائیں گے، سُنا ہے، اب وہ یہاں کے وزیر بننے والے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ جھنڈا بردار کسان، ہیون سانگ کو گالیاں دیتے،

کہ تمہیں اگر انڈیا گیٹ کا راستہ معلوم نہیں تھا تو پہلے کیوں نہیں بتا دیا ۔ آہنی ریلنگ کے سامنے والی سڑک کے دائیں کنارے پر مزدوروں کا ایک جلوس آتا ہوا دکھائی دیا ۔ وہ نعرے لگا رہے تھے ۔

" ساتھیو! ہماری منزل!"

باجماعت جواب آیا " انڈیا گیٹ!"

ہیون سانگ کو مسافروں کی صحیح رہنمائی کا نادر موقع مل گیا ۔ اُن سے کہنے لگا " اس جلوس کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ ۔ انڈیا گیٹ پہنچ جاؤ گے ۔"

جلوس کچھ لمبا لگ رہا تھا کیونکہ دو دو مزدوروں کی پتلی لمبی قطار تھی ۔ ان کے نعروں میں مہنگائی بھتے کی مانگ شامل تھی ، پولس کی بے انصافی کی ، ہڑتال کی بھی ۔ ہیون سانگ کو ان نعروں میں اچھوتا پن نظر نہیں آیا ۔ کیونکہ قیام دہلی کے دوران وہ روزانہ ایسے مظاہرے دیکھ چکا تھا ۔ جو نعرے سے شروع ہو کر نعرے پر ختم ہو جاتے تھے اور پھر اپنے کسی نہ کسی گیراج میں تھک ہار کر لیٹ جاتے اور بیوی اور سرکار دونوں کو گالیاں دیتے دیتے سو جاتے ۔

رُوٹی کے نعرے ، روٹی کی گالیاں ، روٹی کی نیند ۔ مگر انڈیا گیٹ دیسے کا ویسا اپنی جگہ پر قائم رہتا اُسے خراش تک نہ آتی ۔

جس آہنی ریلنگ سے وہ پیٹھ لگائے کھڑا تھا اس کے ساتھ ہی بائیں طرف ، سڑک کراس کرنے کا ایک کھلا راستہ تھا ۔ مگر اچانک

ہیون سانگ کی نظر ایک سانولے رنگ کے دھوتی پوش شخص پر پڑی۔ جو کھلے راستے کی بجائے آہنی ریلنگ کے اوپر چڑھ کر سڑک کراس کرنے لگا تھا۔ ہیون سانگ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ "رُک جائیے، رُک جائیے گر پڑیں گے۔ آپ سیدھے راستے سے کراس کیوں نہیں کرتے۔"

وہ گردن اکڑا کر بول اُٹھا۔ "ہم بنگالی ہیں۔ سیدھے راستے سے جانا پسند نہیں کرتے۔"

"دلی میں کہاں رہتے ہو؟"

"بنگالی بستی میں۔"

"ریلنگ کراس کر کے کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہم کلاکاروں کے اس جلوس میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ انڈیا گیٹ جائے گا۔ انقلاب لائے گا۔ انقلاب زندہ باد!"

"کیا یہ سارا انقلاب انڈیا گیٹ کی طرف جا رہا ہے؟"

"ابھی سالا کون وہاں تک پہنچنے دے گا۔ دفعہ ایک سو چوالیس لگا ہے نا۔ لاٹھی، آنسو گیس، گولی۔"

ہیون سانگ نے دیکھا، وہ بنگالی کلاکار بڑا اُتاؤلا ہو رہا ہے اگر میں نے اُسے یوں پوچھ تاچھ میں اُلجھائے رکھا تو شاید وہ مجھے ایک چپت بھی لگا دے۔ انقلاب سے کچھ بعید نہیں، کیا کر بیٹھے۔ اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ صرف ایک آخری سوال پوچھے اور احتیاطاً چپت کی منزل آنے سے پہلے چلتا بنے۔ پوچھ لے، "بولا! بنگالی بابو کیا یہ سبھی کلاکار دلی کے باشندے

ہیں ؟"

وہ ایک کڑوا کسیلا قہقہہ لگا کر بولا " ارے صاحب! دہلی میں دہلی کا باشندہ کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ ان کامگاروں میں سے کوئی ہریانہ سے آیا ہے، کوئی راجستھان سے، کوئی تامل ناڈو سے تو کوئی مہاراشٹر سے، کوئی کشمیری تو کوئی بہاری۔ سب سالا روزی کا چکر ہے، پھر کہیں بھی ہو روزی دہلی میں ہے۔ قہ قہ قہ قہ۔"

اور یہ کہہ کر وہ اچھلتا کودتا، جلوس میں شامل ہو گیا۔ بنگالی مزدور، ہریانہ اور راجستھان کے مزدور کے ساتھ جا کر مل گیا، ایک ہو گیا۔ اور نعرہ لگانے لگا۔ دنیا بھر کے مزدورو! ایک ہو جاؤ!"

اجنبیوں کا شہر

اور آج بھی ریلنگ کا سہارا لیے، ہیون سانگ ایک دم اداس ہو گیا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے کسی ایسے آدمی کی تلاش میں سرگرداں تھا جو چھاتی ٹھونک کر کہہ دے "ہاں، میں دہلی کا باشندہ ہوں۔ میری رگوں میں دہلی کا خون گردش کر رہا ہے۔"

لیکن کئی دنوں کی جستجو کے باوجود اُسے کوئی ایسا باشندہ نہ مل سکا جس میں دہلی کے خون کی خوشبو ہو۔ اُس خوشبو میں دہلی کی روایات جھانکتی ہوں۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا تھا۔ "دہلی کی اصلی روح دیکھنا چاہتے ہو تو پرانی دہلی کے تنگ و تاریک گلیاروں میں چلے جاؤ۔ وہاں آپ کو

دہلی کی دھرتی سے اُگے ہوئے پھول اور پھل اپنے پورے رکھ رکھاؤ اور اپنے پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ مل جائیں گے۔

لیکن ہیون سانگ نے وہاں بھی جاکر دیکھ لیا۔ اس نے ایک ایسے ہی دہلی والے سے پوچھا "کیوں جی! یہ بلیک میں ملاوٹ آپ نے کی ہے؟"

"اجی، ہم نے کہاں کی ہے۔ ہمارے آبا و اجداد میں تو یہ رواج ہی نہیں تھا۔ یہ تو باہر والوں نے آکر ہم پر اپنے رواج مسلط کر دیئے، اور کیا کریں جی، ملاوٹ نہ کریں تو بازار سے کٹ کر رہ جائیں۔"

اور پھر ہیون سانگ نے ایک پنجابی ڈاکٹر سے پوچھا "کیوں جی! کیا یہ صحیح ہے کہ مریضوں کے مرض کو آپ کرنسی نوٹ بنا کر اپنی میز کی دراز میں منتقل کر دیتے ہیں۔"

"اجی ہم کیا کریں۔ دوائیاں بنانے والی کمپنیاں ہی اتنی مہنگی دوائیاں سپلائی کرتی ہیں آہ! دہلی میں آکر ہماری ساری پنجابیت فنا ہوگئی۔"

ہاں اُس نے پنجابی سے پوچھا، راجستھانی سے پوچھا، بنگالی، مدراسی اور مہاراشٹرین سے پوچھا۔ وہ سبھی دہلی میں رہ کر لوٹتے بھی ہیں، رشوتیں بھی لیتے ہیں، ملاوٹیں بھی کرتے ہیں، روتے بھی ہیں ہنستے بھی ہیں اور پھر جیسے پچھتا وے کی ایک گہری ٹھنڈی سانس بھر کر یہ بھی کہتے ہیں۔ "میں اپنے وطن چلا جاؤں گا۔ دہلی تو میری اصلی روح کو نوچ کر کھا گئی ہے۔"

دہلی کا ہر باشندہ، دہلی میں رہ کر بھی، دہلی کو اپنا شہر نہیں مانتا۔ دہلی

میں رہ کر بھی دہلی سے الگ رہ رہا ہے۔ ہر باشندہ، نہایت تاسف سے
کہتا ہے ۔۔ دہلی کا ہر آدمی بے ایمانی پر کمر باندھے ہوئے ہے۔"
ہاں، ہر آدمی یہ شکایت کرتا ہے۔ مگر کوئی بھی آدمی کسی کے سینے
پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہتا، کہ تم بے ایمان ہو۔ انھیں برسوں سے معلوم
نہیں ہو سکا کہ ہم میں سے کون بے ایمان ہے۔ اگرچہ برسوں سے ہر آدمی
کو یہ یقین ہے کہ اس شہر میں ایماندار آدمی ملنا ناممکن ہے۔ مگر سیدی سانگ
کی پرابلم اور تھی کہ اُسے اس شہر میں دہلی کا باشندہ ملنا مشکل ہو رہا تھا۔
اُسے اس جستجو کے دوران فقط یہی معلوم ہو سکا کہ دہلی میں ہر ذی روح
باہر سے آتا ہے، گھریلو نوکر ہماچل کی پہاڑیوں سے آتے ہیں، عمارتی
مزدور راجستھان سے آتے ہیں، انقلابی، بنگال سے آتے ہیں، انگریزی
بولنے والے مدراس سے آتے ہیں، سیٹھ ساہوکار، گجرات کاٹھیا
واڑ سے آتے ہیں، کاریں، ٹرک، اور بسیں چلانے والے پنجاب سے
آتے ہیں، اہل زبان، یو پی سے آتے ہیں، جیب کترے ہر صوبے سے
آتے ہیں، کرناٹک کا ایک غنڈہ، مہاراشٹر کے ایک غنڈے کو ساتھ
لاکر، بہار کے ایک سرکاری افسر کے بنگلے پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آتا
ہے۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی کا تفتیش کنندہ پولیس افسر مدھیہ پردیش سے
آکر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ غنڈے پکڑ لیے جائیں یا اُس کے وزیر کے فرمان کا
انتظار کیا جائے جس نے ٹیلی فون کیا تھا۔ کہ یہ غنڈے نہیں ہیں، ہماری
پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ اس لئے اُن سے سیاسی سطح پر نبٹا جائے گا۔

کریمنل سطح پر نہیں۔

"اور شاعر اور ادیب اور افسانہ نگار؟" ہیون سانگ نے اپنے ہمراہی سے پوچھا تھا۔ "یہ دانشور حضرات کہاں سے آتے ہیں؟"

"یہ بھی ہر صوبے سے آتے ہیں، ہر زبان سے آتے ہیں اور دہلی میں آکر اپنی اپنی زبان کی الگ الگ لٹریری سبھائیں بنا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تعریفیں بھی کرتے ہیں، ایک دوسرے کی ٹانگیں بھی کھینچتے ہیں۔ اور یوں آرٹ اور ادب اور شعر کی دنیا میں اعلیٰ اور نچلی، جو بھی سطح انھیں شوٹ کیا کرتی ہے، جم جاتے ہیں۔"

اور پھر ایک رات وہ ہمراہی، ہیون سانگ کو ایک بہت بڑے ماڈرن شاعر کی محفل میں لے گیا۔ جو بہار اشٹر سے آیا تھا۔ بہار اشٹر میں وہ سیمنٹ اور پتھر کا لاکھوں کا لین دین کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی دہلی کے پوش جن پتھ ہوٹل میں آکر ٹھہرتا تھا اور ادب اور شعر کی محفل رنگین سجا لیتا تھا۔

ہیون سانگ اپنے ہمراہی کے ساتھ جب جن پتھ ہوٹل کے اُس کمرے میں پہنچے جہاں وہ الٹرا ماڈرن شاعر قیام فرما تھا تو انھوں نے دیکھا، کمرے میں چھ سات حضرات اور بھی موجود تھے۔ جو حرکات و سکنات سے رائٹر سے معلوم ہوتے تھے۔ مکان صوفہ (جو صرف ایک تھا) پر وہ الٹرا ماڈرن شاعر اپنے غیر شاعرانہ تن و توش کے ساتھ تشریف رکھتا تھا۔ اور باقی حضرات اُس کے ارد گرد کرسیوں پر بیٹھی ہوئی مکھیاں لگ رہے تھے۔ ایک مختی قد کی مکھی توصیف کے ساتھ ٹکراتی ہوئی ایک تپائی

پر رکھی ہوئی تھی۔

مسٹر ہمراہی نے مکھیوں کے سوداگر سے ہاتھ ملایا تو مکھیوں کے سوداگر نے صرف اپنی چھنگلیا کی پور ملادی۔ ہیون سانگ نے بھی چھنگلیا سے شرفِ ملاقات کرکے اپنا تعارف کروایا "اس خاکسار کو ہیون سانگ کہتے ہیں چین سے سیاحتِ ہند کے لئے آیا ہوں"

الٹرا ماڈرن شاعر نے مسکراکر کہا "اور مجھے وہی کچھ کہتے ہیں جو نیچے ہوٹل کے ریسپشن والوں نے آپ کو بتایا ہوگا۔"

اس پر تپائی پر بیٹھے ہوئے مخنی ادیب نے ہونٹوں پر دھپ لگاکر کہا "ارے واہ واہ! شریف صاحب، دی گریٹ! کیا الہامی فقرے کا بیج دیا ہے کہ ژاں پال سارترے کی روح بھی جھوم اٹھی ہوگی۔ بس جی! حکمت و دانش کا تو شریف صاحب پر اینڈ ہے۔ آہاہا۔ آہاہا۔ اور مکرر آہاہا"

الٹرا ماڈرن شاعر شریف صاحب نے بیرے کو اشارہ کیا کہ تپائی نشین صاحب کو ایک پیگ اور دو، یہ لائن پر آرہے ہیں۔

ویسے تو سبھی شاعر اور ادیب اپنی اپنی لائن پر آچکے تھے۔ لیکن ابھی مُردے گھسیٹ کر لے جانے والی گاڑی کے اہل نہیں ہوئے تھے۔

محفل میں شراب اور غذات کی فراوانی تھی۔ مُرغ و ماہی، کباب، انڈے تلے ہوئے بھی، کم تلے ہوئے بھی، ہر طرح کی خوراک افراد کے باہر بھی تھی، افراد کے اندر بھی تھی۔ وہ کھا رہے تھے، پی رہے تھے اور اُن کی اپنی

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کھا زیادہ رہے ہیں یا پی زیادہ رہے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ جوں جوں وہ کھاتے پیتے ہیں، توں توں زیادہ بولتے ہیں، اچھلتے ہیں، خوشی سے چیختے ہیں، بلکہ ایک شاعر تو اپنی عظمت کے زعم میں اتنا ڈوب گیا تھا کہ بغیر کسی کے مطالبے کے خود بخود ہی اپنی نظم کے مصرعے سنائے جا رہا تھا۔

ذات کی تاریک پہنائی میں
ایک مرغا، چونچ میں لئے سورج
بکھر گیا، مر گیا،
اور کہنے لگا، موت کا دیوتا
یہی جاوداں موت ہے،
جاوداں موت ہے، جاوداں
جاوداں، جاوداں
جاوداں، جاوداں

اُس کی نظم کوئی نہیں سن رہا تھا۔ وہ شاعر اپنی ذات کی پہنائیوں میں پرواز کرتا ہوا، خود ہی کہے جا رہا تھا ...... "اور عرض کیا ہے ....."

"اور مکرر عرض کیا ہے ....."

"اور داد عرض کی ہے کہ واہ واہ اور آہ آہ!"

عرض، مکرر، داد —— چونکہ یہ سب عہد قدیم کے آداب تھے۔ اور وہ سبھی دانشور، ایٹمی عہد کے فن کار تھے، اس لئے ماحول میں ان کے

اندر سے ایٹم کے کئی ذرے پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہے تھے۔ فضا میں ناچ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ چنگاریاں سی چھوڑتی ہوئی کئی نمونوں کی آوازیں، کمرے میں جھن جھنا رہی تھیں۔ اور وہ جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ایک دوسرے کی سن نہیں رہے تھے۔

" یہ انبوہ کے فنا ہونے کی علامتیں ہیں۔ علامتی شاعری انبوہ کی موت۔!"

" چونکہ روشنی ہے، سورج ظلمت ہے۔ فائن بلکہ ریفائن آئیڈیا۔"

" یار دا میں تو اندر سے ٹوٹ رہا ہوں۔ ٹوٹنے کی یہ موسیقی سنو"

" باطن بھی ادب عالیہ کو کچل بھی رہا ہے، زندگی کا قہقہہ، پیزا کی پینٹنگ پر بیٹھا کہہ رہا ہے۔ "کچلو کچلو، ککڑ دکوں، ککڑ دکوں!"

" سنگ دوستو! رفیقو! شریف صاحب، خدا کا ہوس ہیں۔ جو جنت سے اتر کر جہنم کے ہونٹوں پر رس ٹپکا رہا ہے۔"

ہیون سانگ نے ہمراہی سے کانا پھوسی کی " یہ کون لوگ ہیں، کیا کہہ رہے ہیں، کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

اس نے کہا " خاموش! یہ شعر و ادب کے لئے خدا ہیں۔ ان کا باطن اجڑ گیا ہے۔ اور باطن کی اس خزاں کو پر بہار بنانے سے ڈرتے ہیں۔ کہ اثبات میں انکار کے آثار پیدا نہ ہو جائیں۔ در اصل یہ باہر کی دنیا سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے اپنی ذات کی طرف بھاگ کر جائے پناہ تلاش کر

رہے ہیں ۔"

ہیون سانگ کی نظر میں گہرائی کی بات بھی نہیں آئی ۔ اس لئے اُس نے گوپیوں کے ماڈرن کنھیا صدر نشین مسٹر شریف سے ڈائرکٹ سوال کیا "مسٹر شریف! سیمنٹ کی پروڈکشن کی آج کل کیا پوزیشن ہے؟"

مگر مسٹر شریف کی بجائے ایک چھوٹے اور بڑی توند والے دانشور نے جواب دیا "پوزیشن؟ میں تو جانوں ، ایکسی لینٹ ہے ۔ ایکسی لینٹ نہ ہوتی ۔ تو آپ جانتے ہیں ، یہ کمرہ ، جس کا چار سو روپیہ روزانہ کرایہ ہے ، وہ کہاں سے آیا ؟ سیمنٹ سے ۔ انڈر سٹینڈ ! سیمنٹ سے ۔"

دوسری مکھی نے سیمنٹ کی پوزیشن مزید روشن کی ۔ "اور یہ کمرہ بمبئی کے ایک فلم پروڈیوسر نے مستقل طور پر بک کر رکھا ہے ۔ کوئی ایرا غیرا یہاں نہیں رہ سکتا ۔ یہ تو شریف صاحب کی فنکارانہ عظمت ہے کہ انھیں فلم پروڈیوسر صاحب ہمیشہ عنایت کر دیتے ہیں ۔"

" اور کمرے کی غرض یہ ہے " تیسرا بولا " یہ کمرہ ایک طلسم ہوشربا پیدا کر دیتا ہے ۔ فلم پروڈیوسر صاحب جب بھی یہاں قیام فرما ہوتے ہیں ایک ایکسٹرا گرل بھی ہمراہ ہوتی ہے ، اور جب وہ کمرہ سے باہر آتی ہے تو ہیروئن بن چکی ہوتی ہے ۔"

" ہپ ہپ ہرے ! " سبھوں کی زبان سے ستائش کا نعرہ نکلا ۔ نعرہ ہیرے سے ٹکرایا ، ایک ایک پیگ اور کمرے میں داخل ہوا اور سبھوں کو ہیروئن بنا دیا گیا ۔ اگرچہ ایک دانش ور تو ہیروئن بننے سے پہلے فیڈ آؤٹ ہو چکا تھا ۔

شریف صاحب نے ایک ملازم کو اشارہ کیا کہ ہندوستان کے اس عظیم نقاد کو میری گاڑی پر بس سٹاپ تک چھوڑ آؤ۔
سبھی عش عش کرنے لگے۔ چونکہ وہ الٹرا ماڈرن تھے۔ اسی لیے ہر نئی بات پر عش عش کر اٹھتے تھے۔ سائنس کے ذہنی ارتقا کا بھی یہی تقاضا تھا۔

ہیوان سانگ کا دم گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ برداشت اس لیے کئے جا رہا تھا کہ علم و دانش کی اس دنیا سے وہ ابھی اپنی سیاحت کی تشنگی نہیں بجھا سکا تھا۔ چنانچہ اس نے پھر شریف صاحب سے پوچھا "جناب! آپ کے اپنے سیم دار میں، شاعر کیوں بن گئے یہ تشنہ ہے، ہندوستان کے شاعر تو ہمیشہ ہر جگہ با رہا بہتر اور حسین تخلیقات پیش کرتے تھے۔"

لوٹ مار کا دن

ایک دن ہیوان سانگ نے ایک عجیب فیصلہ کیا کہ وہ آج دہلی شہر میں یوں گھومے گا جیسے اس کا کوئی مقصد نہیں، کوئی منزل نہیں، کوئی نشانہ نہیں۔ اس شہر میں چلتے ہوئے بھی شہر سے الگ تھلگ چلے گا۔ کیوں کہ اس نے چند دنوں میں محسوس کیا تھا کہ اس شہر کے سول صدی باشندے بھی شہر کے باسی ہونے کے باوجود شہر سے الگ ہی رہتے ہیں۔
آخر اس طرح جینے میں کوئی نہ کوئی لذت ضرور ہو گی۔ وہ بھی اس لذت سے آشنا ہونا چاہتا تھا۔ جنتر روڈ کو ملانے والے ایک

فٹ پاتھ پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ وہ مونگ پھلیوں کا ایک چھوٹا سا خوانچہ لگائے ہوئے تھا۔

عینک کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ ایک ہی شیشے سے کام چلا رہا تھا۔ جب بھی کوئی راہ گیر اس کے قریب سے گزرتا۔ خوانچہ فروش ہانک لگاتا۔

"کھاؤ سینے ہوئے بادام!"

وہ مونگ پھلیوں کو بادام کہہ کر بادام کا مرتبہ گرا رہا تھا۔ مونگ پھلیوں کا مرتبہ بڑھا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں گرا بڑھا رہا تھا۔ مگر کوئی بھی راہگیر اس کی ہانک پر رکتا نہیں تھا۔ سبھی راہگیر بہرے تھے۔ ہیون سانگ تین چار منٹ تک کھڑا اس بہرے شہر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر نجانے اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ وہ خوانچہ فروش کے پاس جا کر بولا۔

"بھائی صاحب جی! میں آپ کو کم سے کم کتنے پیسوں جن سے آپ مجھے کم سے کم مونگ پھلیاں دے دیں گے۔"

وہ بولا۔ "پچیس پیسے ۔۔۔ بتائیے تول دوں؟"

ہیون سانگ نے سر ہلا کر "ہاں" کہہ دی۔ خوانچہ فروش اپنے چہرے سے بھی زیادہ جھریوں بھرا ترازو اٹھا کر مونگ پھلیاں تولنے لگا۔ ابھی وہ یہ پاسنگ وا تول ہی رہا تھا کہ اچانک فضا میں ایک آواز ابھری "کمیٹی آگئی، کمیٹی آگئی۔"

اور خوانچہ فروش گڑبڑا گیا۔ اس کے لڑکھڑاتے ہوئے جسم میں ایک

برقی کرنٹ دوڑی، جلدی سے اس نے وہ خوانچہ، عقب کی خشک نالی میں پھینکا۔ اور خود بھاگ گیا ــــ ہیون سانگ کچھ ہکا بکا ہو گیا وہ کچھ بکلا ابھی ہو ہی رہا تھا کہ تیزی سے ایک سیاہ رنگ کا ٹرک اُس کے قریب آکر رُکا، اور اُس میں سے تین چار آدمی نیلگوں رنگ کی وردی پہنے اتر گئے۔ ایک آدمی نے ہیون سانگ کو کلائی سے پکڑا اس کی پکڑنے میں وحشت سی تھی۔ دوسرا آدمی عقب کی خشک نالی میں اتر کر مونگ پھلیوں کا خوانچہ باہر نکال لایا اور ٹرک پر پھینک دیا۔ تیسرے آدمی نے جو شاید افسر تھا، کیونکہ ہر دو آدمیوں کے اوپر ایک نہ ایک افسر ضرور ہوتا ہے۔ ہیون سانگ کی طرف اشارہ کیا "اس سالے کو بھی خونچے کی طرح ٹرک پر پھینک دو ــــ کیا نام ہے بے تمہارا؟"

"ہیون سانگ!"

"ٹھیک صحیح نام بتاؤ۔"

"ہیون سانگ!"

"کیا کہا، ہنومان سنگھ۔ مونگ پھلیاں بیچنے کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"لائسنس، جی، میں تو ..... یہ"

"کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ لے چلو سے ٹاؤن ہال۔ وہاں اس کی ساری ہیں ہیں نکل جائے گی۔ سالے بغیر لائسنس کے مال بیچتے ہیں جیسے ان کے باپ دادا کی سڑک ہو۔ ہنھ! کمیٹی کی لاری دیکھتے ہیں تو مال نالی میں۔

جیسے ہمیں اندھا بناتے ہیں۔"

"مگر جناب! سنئیے تو، یہ خوانچہ میرا نہیں ہے، ایک غریب کا ہے۔"

"ارے ہاں ہاں، اس شہر میں ہر جرم کرنے والا اپنے آپ کو غریب ہی بتاتا ہے۔ چلو بیٹھ جاؤ لاری میں یا تمہیں غریبی سمیت سڑک میں پھینک دیں بابا۔"

پھینکے جانے سے بہتر وہ خود ہی لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری چلی گئی، کئی سڑکوں کے چکر کاٹتی رہی، راستے میں کئی ہیوں سانگوں اور ان کے خوانچوں کو اپنے اندر لادتی رہی۔ خوانچے سگریٹوں کے، ریوڑیوں کے، گجک کے، پھلوں کے، کسکٹوں کے، پکوڑوں کے۔ لاری مختلف خوانچوں کی بھانت بھانت کی خوشبوؤں اور بدبوؤں سے یوں معمور ہو گئی جیسے یہ لاری نہ ہو کوئی شاپنگ سینٹر ہو۔ جیسا جائز طور پر تعمیر ہوا ہو۔

"لے چلو ان سب کو بڑے صاحب کے روبرو۔ اور ان کا سامان مال خانے میں جمع کرا دو" لاری پر بیٹھے افسر نے حکم دیا۔

ہیوں سانگ بھی نیچے اترا۔ اور افسر سے بولا "جناب ہمیں بڑے صاحب کے روبرو پیش نہیں ہونا لگا۔"

"ہونا پڑے گا۔ ورنہ نافرمانی کا جرمانہ الگ دینا پڑے گا۔"

"مگر جناب! وہ مونگ پھلیوں والا خوانچہ میرا نہیں تھا۔ میں مونگ پھلیاں بیچ نہیں رہا تھا۔ خرید رہا تھا۔ کہ آپ نے دھر لیا۔"

"جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ کا جرمانہ الگ دینا پڑے گا۔"
ایک ادھیکاری نے کہا۔

"میں بڑے صاحب کے سامنے کہہ دوں گا۔ کہ آپ نے غلط آدمی پکڑ لیا۔" ہیون سانگ نے جیسے دھمکی دی۔

"کہہ دینا۔ کہہ دینا۔ بڑے صاحب کے پاس ایسی بک بک سننے کی فرصت ہی کہاں ہے، وہ تو صرف چالان پر دستخط کرتا ہے۔ ہمارا لکھا ہی کافی سمجھتا ہے۔"

ہیون سانگ کے منہ سے بے ساختہ غالب کا مصرع نکلا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

اور پھر مصرع پڑھنے کے بعد وہ زار و قطار رونے لگا۔ ایک ادھیکاری جو نجانے کیسے رقیق القلب نکل آیا۔ اُسے روتے دیکھ کر اس کا جی بھی بھر آیا۔ بولا "چھوڑ دو بچارے کو۔ یہ تو روتا ہے۔"

"مگر چھوڑنے سے پہلے اس سے لکھوا لو کہ یہ خوانچہ میرا نہیں ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ خوانچہ رکھ لو۔ اسے چھوڑ دو۔"

اس پر خوانچہ اُتارا گیا۔ کچھ مونگ پھلیاں نیچے گر گئیں۔ کچھ مونگ پھلیاں ادھیکاریوں نے اپنی جیبوں میں بھر لیں۔ اور پھر چھوٹے افسر نے ہیون سانگ کو جھڑک کر کہا "بھاگ جاؤ یہاں سے اب دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔"

ہیون سانگ نے کہا "مگر جی! یہ پچیس پیسے کی مونگ پھلیاں

تو مجھے دے دو۔

"دے دو، دے دو، سالے کو۔"

اور سالے سے کچھ پیسے لے کر اسے بغیر تولے، دو مٹھیاں بھر کر مونگ پھلیاں دے دی گئیں۔ حاکم لٹیرے جب مالِ غنیمت بانٹتے ہیں۔ تو نرخ اور وزن کے چکر میں نہیں پڑتے۔ کیوں کہ نرخ اور وزن تو امن پسند شہریوں کا الیوژن ہوتا ہے۔ لوٹ مار میں الیوژن نہیں ہوتا، احساسِ فتح کی برتری ہوتی ہے۔

بھگدڑ، بھاشن اور بھیڑ

جب ہیون رانگ کیٹی گھر کے احاطے سے باہر نکلا تو سرعت سے بھاگنے لگا۔ اُسے اپنا یوں بھاگنا ایسا لگا جیسے وہ کوئی جرم کر رہا ہو۔ مگر اُس نے سوچا، جرم کا یہ احساس اُس آب و ہوا کی تاثیر ہے جو فضا میں چل رہی ہے۔ جب تک بے گناہ اپنے اندر یہ احساس پیدا نہ کرے، کہ وہ مجرم ہے اس وقت تک وہ یہاں کا باشندہ نہیں مانا جاتا۔

ایک شخص نے اسے بھاگتے دیکھ کر راستہ روک لیا۔ اور جیسے چیخ کر کہا۔ "ٹھہر جاؤ!"

ہیون سانگ ٹھہر گیا۔

"تم کیوں بھاگ رہے ہو۔ کیا تمہارا کوئی تعاقب کر رہا ہے؟

"نہیں تو......"

اور یہ کہہ کر ہیون سانگ نے پوچھا، "اگر آپ کے سوالات ختم ہو گئے ہوں تو مجھے پھر بھاگنے دو۔"

"مگر بھائی! بھاگنے کی وجہ تو بتا دو۔"

ہیون سانگ کے پاس چونکہ کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لئے وہ خاموشی سے کھڑا اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ شخص مذکور شرافت سے کام لے کر مجھے بھاگنے کی آزادی عطا کر دے۔ مگر اس سے پہلے کہ شخص مذکور اپنی صدیوں سے خوابیدہ شرافت کو جھنجوڑ کر جگاتا ایک اور آدمی اُن کے پاس آ کر رک گیا۔ اور بولا، "کیا جھگڑا ہے؟"

"پہلا شخص بولا، "یہ بھاگ رہا ہے۔"

"تو بھاگنے دو۔"

پھر ایک تیسرا آدمی آ گیا۔ "کیا معاملہ ہے بھائی؟"

"یہ بھاگ رہا ہے۔"

پھر چوتھا، پھر پانچواں، چھٹا۔ ہر ایک نے صورتِ حال کی تفتیش کی، ہر ایک کے پلّے یہی جواب پڑا کہ یہ شخص بھاگ رہا تھا اور پھر جب ساتویں نووارد نے آ کر مشورہ دیا کہ اسے تھانے لے جاؤ، وہاں اس کے بھاگنے کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔ تو...... ہر ایک نے کھسکنے کی کوشش کی کیونکہ انصاف بڑا طویل وقت مانگتا تھا اور اُن میں سے کسی کے پاس فرصت نہیں تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ ایک ایک کر کے کھسکتے ۔ دور سے ایک کانسٹبل نمودار ہوا ۔ وہ کڑک کر بولا " ارے ، یہ کیا مجمع خلافِ قانون لگا رکھا ہے ، جانتے نہیں ، اس سڑک پر دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے ۔ پانچ سے زیادہ آدمی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔ سب کو تھانے لے جاؤں گا "

یہ سن کر نہ صرف ہیون سانگ بلکہ وہ ساتوں آدمی بھی بھاگنے لگے ۔ اس مرتبہ بھاگنے کی وجہ سب کو معلوم ہو گئی تھی ۔

تھوڑی دور تک جا کر ہیون سانگ نے بھاگنا ملتوی کر دیا ۔ اب اُسے اتنی عقل آ گئی تھی کہ یہاں بھاگنا خطرے سے خالی نہیں ۔ ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی وجہ موجود ہے ، کوئی نہ کوئی کانسٹبل موجود ہے ۔ چند گز کے فاصلے پر ایک خالی بس کھڑی تھی ، لوگ کیو میں کھڑے بس پر چڑھتے جا رہے تھے وہ بھی کیو میں کھڑا ہو گیا ۔ کنڈکٹر نے آ کر اُس سے پوچھا " کہاں کا ٹکٹ دوں ۔ ؟ "

" کہیں کا بھی دے دو "

" ارے تمہاری کوئی منزل نہیں ہے ؟ "

" کیا ان سب لوگوں کی کوئی منزل ہے ؟ "

اس پر قہقہہ لگا ۔ ایک مسافر نے کہا ۔ کوئی دیوانہ ہے ، دوسرے نے کہا کوئی جیب کترا ہے ۔ تیسرا بولا ۔ دیوانہ ہے یا جیب کترا ، ٹکٹ لینا اس کا جمہوری حق ہے ، کنڈکٹر ! تم پیسے لے کر ٹکٹ کاٹ دو ، تمہیں پیسوں سے مطلب ہے یا اس کی دیوانگی سے ۔ "

لفظ جیب کترا کان میں پڑا تو کیو میں کھڑا ایک مسافر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اگر اُس کی جیب ہی کٹ گئی تو..... ؟ لہٰذا علاج سے، پرہیز بہتر ہے۔

بہرکیف ہیون سانگ ٹکٹ خرید کر بس پر سوار ہو گیا۔ اگرچہ اُس نے دیکھا کہ بس کا ہر مسافر اُس سے الگ الگ کھڑا ہونے کا جتن کر رہا ہے ہر مسافر کا ہاتھ اپنی جیب پر ہے۔ چند منٹ بعد ہیون سانگ نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کی، کہ صرف میری موجودگی سے ان سبھی مسافروں کا سفر آرام دہ ہو رہا ہے۔ ہر مسافر بچارا بڑے دبے گھٹے لمحے گزار رہا ہے۔ لہٰذا مجھے اگلے بس اسٹاپ پر اتر جانا چاہیے۔

چنانچہ وہ اگلے بس اسٹاپ پر اتر گیا۔ سبھی مسافروں نے ایک شکھ کا سانس لیا ہیون سانگ نے بھی لیا کہ میرے ایکشن سے کئی انسانوں کو سُکھ کا سانس لینا نصیب ہوا ہے۔ بس سے اتر کر وہ گنّے کے رس والے ایک دستی بیلنے کی طرف بڑھا۔ تاکہ رس کا ایک گلاس پی کر اطمینانِ قلب حاصل کرے۔

بیلنے کے قریب پہنچنے پر اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا بٹوا غائب ہے جسے کھول کر اُس نے بس کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اس نے خدا اور جیب کترے دونوں کا شکریہ ادا کیا کہ صرف وہی بٹوا نکالا گیا ہے جس میں کچھ پیسے اور پانچ سات روپے تھے۔ جس بٹوے میں زیادہ نوٹ تھے وہ صدری کی خفیہ جیب میں تھا اور محفوظ تھا۔

ہیون سانگ نے رس کا گلاس پیتے پیتے بیلنے والے سے پوچھا ۔
"بھیّا! کہاں کے رہنے والے ہو ۔"

وہ بولا "اجی' راجستھان کے ایک گاؤں سے آیا ہوں، وہاں بھوکا مرتا تھا، یہاں آپ لوگوں کی مہربانی سے دو روٹیاں مل جاتی ہیں ۔"

ادھر سامنے سرسبز میدان میں ایک جلسے کی سٹیج پر ایک لیڈر تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "اور بھائیو اور بہنو! اصلی ہندوستان گاؤں میں ہی بستا ہے اور جب تک گاؤں موجود ہیں، ہندوستان بھوکا نہیں مر سکتا۔"

اور ہیون سانگ کو نہ جانے کیا سوجھی' گنے کے ٹھنڈے اور شیریں رس کا جادو تھا یا اُس کی اپنی بدنصیبی کہ اُس نے وہیں سے کھڑے کھڑے بلند آواز میں اسٹیج سے مخاطب ہو کر کہا "نوجناب! کیا دہلی شہر میں جو ہندوستان بستا ہے ۔ وہ نقلی ہے ۔؟"

جلسہ گاہ کے سامعین کے سبھی کان ہیون سانگ کی طرف گھوم گئے اور چار خاکی وردی پوش والنٹیر، اپنے ڈنڈوں سمیت' ہیون سانگ کی طرف لپکے ۔ ایک نے اُس کی گردن پکڑی، "کون ہو تم ؟"

دوسرے والنٹیر نے ڈنڈے کی نوک اُس کی پیٹھ پر چبھوئی "بھائی جلسے کو ڈسٹرب کرنے آیا ہے ۔"

"اپوزیشن والوں کا کوئی زرخرید ایجنٹ ہے ۔"

"کشاں کشاں اسے لے چلو ۔"

"ہاں لے چلو یہ لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہے، مذاق نہیں ہے ۔"

" اور دیکھو تو، پولیس کا محافظ دستہ دور سے کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے "

" ارے چھوڑو یار! ہم خود اس سے نپٹ لیں گے۔ پولیس بھی تو اپوزیشن والوں سے ملی ہوئی ہے "

اور پھر دو چار منٹ میں جلسہ جیسے اکھڑ گیا۔ سامعین جائے واردات کی طرف بڑھنے لگے۔ جس چیز کی بنیاد کمزور ہو، وہ جلدی اکھڑ جاتی ہے۔ سامعین کو لیڈر کے مقابلے پر ہیون سانگ زیادہ دلچسپ اور دلیر معلوم ہوا۔ اسٹیج سے لیڈر بار بار کہے جا رہا تھا۔ " دیش باسیو! لوٹ آؤ، لوٹ آؤ، میں دشمنوں کی سازش سے نہیں ڈرتا۔ چاہے مجھے سولی دے دو، عمر قید دے دو۔ لیکن میرے منہ سے برابر یہ لفظ نکلیں گے کہ اصلی ہندوستان دیہات میں بستا ہے۔ والنٹیرو! امن و امان قائم کرو۔ اور زور سے کہو، انقلاب زندہ باد!"

اور پھر والنٹیروں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ اور ایک جیپ میں ہیون سانگ کو دھکیل کر لے جایا گیا۔ اگرچہ ہیون سانگ اُن سے بار بار کہتا رہا " والنٹیر بھائیو! مجھے اس بیچارے بیلنے والے دیہاتی غریب کے رس کے گلاس کے پیسے تو ادا کرنے دو۔"

مگر والنٹیروں نے جواب دیا۔ " انقلاب زندہ باد!"

اور ہیون سانگ نے ٹھنڈی آہ بھر کر آنکھیں موند لیں۔ اور جب دوبارہ کھولیں۔ تو اس نے دیکھا کہ وہ جمنا ندی کے کنارے کی ریت

پر کھڑا ہے۔ اور اصلی ہندوستان کی جیب واپس جا رہی ہے۔ شاید جلسہ گاہ کی طرف، شاید نقلی ہندوستان کی طرف، شاید اُس بھوکے ہندوستان کی طرف جو گاؤں سے رس کا بیلنا اُٹھا کر دہلی شہر میں آن بسا تھا اور اُسے یہاں پیٹ بھرنے کے لئے دو دو دمڑیاں مل رہی تھیں۔

وہ جمنا ندی کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ اس نے سنا تھا کہ یہ ہندوستان کی مقدس ندیوں میں سے ہے۔ لوگ اُس میں اُس وقت غسل کرتے ہیں۔ جب وہ کافی پاپ کر چکے ہوں۔ نئے پاپ کرنے سے پہلے پرانے پاپوں کو اس مقدس ندی میں آکر پھینک جاتے ہیں۔ اور غسل کر کے پھر تر و تازہ پاپ کرنے لگتے ہیں۔ اس اشنان کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر پھر بھی کرتے ہیں۔

اور جو لوگ پاپ نہیں کرتے وہ بھی یہاں آکر اشنان کرتے ہیں۔ اُن کے اشنان کی وجہ بھی آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔

راستے میں ہیون سانگ کو ایک آدمی ملا جو ننگے پاؤں تھا۔ وہ ہیون سانگ سے پوچھنے لگا۔

"کدھر جا رہے ہو؟"

"بڑا دکھی ہوں، خودکشی کرنے جا رہا ہوں"

"فضول ہے۔ میں خود وہاں سے ناکام لوٹ رہا ہوں۔ گھاٹ پر پولیس کا پہرہ ہے۔"

ہیون سانگ نے پولیس کے پہرے کا سبب دریافت کیا۔

تو اُس شخص (اُس نے اپنا نام دینا ناتھ بتایا تھا) نے بیان کیا کہ آج صبح چونکہ سٹوڈنٹس کے سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلا ہے۔ اس لیے فیل سٹوڈنٹس اپنے گھر کی بجائے جمنا میّا کا رُخ کر رہے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ فیل صرف وہی طلبا ہوتے ہیں۔ جو پڑھائی میں اعلیٰ درجہ کے ذہین ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ کمرۂ امتحان میں نقل نہیں کرتے۔ اس لئے فیل ہو ہی جاتے ہیں۔ آج کل پاس ہونے کے لئے نقل کرنا ہی دیانت سمجھی جاتی ہے۔

واپسی پر ہیون سانگ نے دینا ناتھ سے پوچھا "دیکھئے، میں اس دیس میں اجنبی ہوں۔ کیا یہاں خودکشی کے لئے اور بھی طریقے مروج ہیں یا نہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں۔ کسی ایسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیے۔ جو سوشلزم لانا چاہتی ہو۔ مگر کروڑ پتیوں کے بنگلوں میں کام کرتی ہو۔ یہ بذات خود ایک خودکشی ہے۔"

"کوئی اور اس سے معقول طریقہ!"

"فرقہ وارانہ فسادات میں مر جائیے۔"

"وہ کب ہونے ہیں۔"

"فسادات کا کوئی موسم نہیں ہوتا اور ہر موسم فسادات کا ہوتا ہے۔ مسجد کے آگے باجا بجائیے۔ دس بارہ آدمی ہلاک، پیپل کے پیڑ کے ساتھ تعزیئے کا کونہ ٹکرا جائے، پندرہ بیس انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آسمان سے اتری ہوئی الہامی کتاب، قرآن، گیتا، گرنتھ اور بائیبل کا کوئی ورق پھاڑ کر سڑک

پر پھینک دیجئے، تو تیس چالیس مکان کھنڈر بنا دیئے جاتے ہیں۔ تین چار دس عورتیں بیوہ بن جاتی ہیں اُن کے دُگنے تگنے بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اوراق کی تعداد دو یا چار یا آٹھ ہو تو اُسی حساب سے مکانوں، بیواؤں اور یتیموں کی تعداد بھی بڑھا لیجئے۔ آپ کونسے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔؟

ہیون سانگ نے کہا۔" انسانیت سے۔"

آہ سرد بھر کر دینا ناتھ نے کہا۔" پھر تو بڑی مشکل ہے۔ آپ کا کیس ہوپ لیس ہے، جمنا یا ہی آپ کے لیے آغوش وا کر سکتی ہے۔ مگر وہاں پولیس کا پہرہ ہے۔؟

" تو کیوں نہ وہاں پولیس کی گولی سے ہلاک ہو جائیں۔"

" نان سینس۔ پولیس کی گولی سے ہلاک ہونے کا بہترین موقعہ وہ ہوتا ہے۔ جب آدمی دیش پر قربان ہونے کی سکیم بنالے۔ شہید کہلائے اور اُس کی چتا پر ہر برس میلے لگیں۔ ورنہ ویسے ہی پولیس کی گولی سے ہلاک ہونا تو بزدلی ہے۔ ایسی بزدلی تو عوام دکھا سکتے ہیں۔ کوئی خود دار آدمی نہیں۔؟

ہیون سانگ کو یوں لگا جیسے دینا ناتھ کافی باشعور آدمی تو ہے۔ مگر کافی جلا بھنا بھی ہے۔ خوددار تو ہے مگر خودکشی کرنے کے لئے پولیس سے ڈرتا ہے۔ بلکہ یہ خودکشی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ شاید اس کے سینے میں خیالات اور جذبات کا کوئی کرب ہے۔ جسے وہ دوسروں پر اگل کر شانتی

حاصل کرنا چاہتا ہے۔

جونہی وہ ایک چوراہے پر پہنچے۔ ہیون سانگ نے پوچھا: اب آپ کدھر جائیں گے۔

"کم از کم اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ وہاں میری ایک کنواری جوان بیٹی بیٹھی ہے۔ میرے راستے کا پتھر جو اٹھائے نہ بنے اور گرائے نہ بنے؟"

ہیون سانگ نے پچھلے چند دنوں سے دہلی کے اخباروں میں کئی واقعات پڑھے تھے۔ جن میں کنواری اور بیاہتا دونوں لڑکیاں جہیز کی پھانسی پر جھول جاتی تھیں۔ اگرچہ اسے حیرت ہوئی تھی کہ تیرہ دن میں سے ایک بھی مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے آپ کو کیوں نہیں جلاتا تھا۔ اس قربانی کا ٹریفک یکطرفہ کیوں تھا؟

شاید دینا ناتھ کا بھی یہی معاملہ ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کیس میں لڑکی کی بجائے لڑکی کا باپ خودکشی کے لئے گیا تھا۔ ہیون سانگ کا جی چاہا، دینا ناتھ کو آج اپنے ساتھ آدرش گیسٹ ہاؤس میں لے جائے۔

اور پھر...... اور پھر......

مگر اور پھر...... کا یہ ایک گاڑھے دھوئیں میں کھو گیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستہ ڈگر ڈگر کرتا، ایک ہجوم کا تعاقب کر رہا ہے۔ ہجوم پر لاٹھیاں چلائی جا رہی ہیں، آنسو گیس کے گولے پھینکے جا رہے ہیں۔ اور پھر جب نیم بے ہوشی کے عالم میں ہیون سانگ نے آنکھ کھولی تو اس کے پہلو میں دینا ناتھ کی

لاش پڑی تھی۔ ایک بندوق بردست سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ ہیون سانگ نے ڈرتے ڈرتے پہرے دار سپاہی سے پوچھا "بھائی! یہاں آج کیسی در گھٹنا ہو گئی؟"

وہ منہ پر انگلی رکھ کر بولا "چپ چاپ یہاں پڑے رہو۔ آج یہاں ایک فرقہ وارانہ دنگا ہو گیا ہے۔ اس علاقے میں کرفیو لگ گیا ہے تم بغیر کرفیو پاس کے کہیں نہیں جا سکتے۔"

ریٹائرمنٹ

اور آخر ایک شام میں دفتر سے ریٹائر ہو گیا۔ تو مجھے دو شدید صدمے ہوئے۔ ایک تو وہ شام سرمئی تھی۔ جو نہایت دلآویز لگی میرے ریٹائرمنٹ کے غم میں اگر وہ کم از کم آج سرمئی نہ ہوتی۔ تو میں سمجھتا کہ حق رفاقت نبھا رہی ہے۔ مگر آہ! ؏

سیاہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے

اور دوسرا صدمہ سورج نے پہنچایا کہ میرے تعلقات سورج سے بُرے نہیں رہے تھے۔ لیکن وہ ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ جبکہ میری ایکٹیوٹی غروب ہو چکی تھی۔ میں نے دوستانہ شکایت کے طور پر سورج سے کہا۔

"اگر آج میرے ساتھ آپ بھی غروب ہو جاتے تو کیا حرج تھا"

اس نے جواب دیا۔ "آج میں اوور ٹائم کر رہا ہوں"

کمال ہے ؟ ایک بزم خود آزمی ریٹائر ہوگیا۔ مگر کسی کو جھٹکا نہیں لگا۔ شام بدستور سرمئی رہی۔ سورج اند ٹالم کر رہا ہے، کلی کھل کر پھول بنتی رہی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ سٹی کے سامنے پارک میں ایک لیڈر تقریر کر رہا ہے اور اپنے آپ کو دہرا رہا ہے کہ اس ملک میں سرمایہ داری ختم ہوگی یا میں ختم ہو جاؤں گا ـــــ ریٹائرمنٹ کے بعد میرا سب پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ اور میں نے سوچا۔ اب میں بے اعتباری کی منزل میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور اسی نئے ماحول سے ہی اڈجسمنٹ کرنا ہو گی۔

راستے میں کشوری لال جی ملے۔ اپنی انفرادیت دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے انہوں نے یہ تکنیک اختیار کی تھی۔ کہ خدا کو نہیں مانتے تھے۔ ماتھے پر ہمیشہ ایک ملحدانہ تیوری رہتی تھی۔ لیکن آج دیکھا تو تیوری تھی نہ نادیہ بلکہ ان کی بجائے ماتھے پر ایک لمبا تلک تھا۔ میں نے پوچھا " ہیلو کشوری لال جی! آپ کے کفر کی کیا پوزیشن ہے "

بولے " کفر ترک کر دیا۔ آج کل خدا کو ماننے لگا ہوں "

میں نے مسکراتے ہوئے کہا " گویا کفر سے آپ ریٹائر ہو گئے ؟ "

اس سے پہلے کہ وہ میری مسکراہٹ پر طمانچہ لگاتے۔ خدا کے حق میں بھی تقریر کرنے لگے۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ خدا بھی عجیب چیز ہے۔ آپ کفر کے حق میں بھی مضبوط دلائل دے سکتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کا دلائل سے کوئی تعلق نہیں اور خدا کا تو ان دلائل سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ نہ اپنی موافقت کے دلائل، نہ مخالفت کے۔ گھر پہنچنے سے پہلے اپنی محبوبہ کے مکان

کے سامنے جا کر رکا۔ جو چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اور مجوبیت کی تاریخ کے دور کے متقدمین میں شمار ہوتی تھی۔ مکان کے باہر کھڑی دکھائی دی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی تبسّم فرمایا۔ تبسّم میں میرے مصنوعی دانتوں کی بھی شرکت تھی ـــــ یوں لگا، تبسّم تو ہے مگر ریٹائر ہو چکا ہے۔

جواباً اُس نے بھی تبسّم روح دیا ـــــ مگر آہ! وہ بھی ایسا تبسّم تھا۔ جیسے کوئی بادشاہ گدی سے اتر چکا ہو۔

میں نے پوچھا "رفیق عشق کا راہی کس منزل پر ہے۔"

وہ بولی "بریم کنواریوں کے آشرم جا رہی ہوں۔"

میں نے عرض کیا (پہلے عرض نہیں کرتا تھا، ایکشن کرتا تھا) "میں آج سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ حرکت و حرارت کے وہ سابقہ آتشیں بوسے جو راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ تمہیں دیکھتے ہی اس ڈھیر میں سے ایک چنگاری چمکی ہے یوں لگا چنگاری ہمارے لبوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

وہ کہنے لگی "سوری! میرے بوسوں کا اسٹاک ختم ہو چکا ہے۔ آخری بوسہ بریم کماری آشرم کی نذر کر چکی ہوں ـــــ مگر گھبراؤ نہیں، ملتوی نہیں اسے اگلے جنم میں سہی۔ کیونکہ اب یہ آشرم ہی میری شانتی کا مرکز ہے۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی اور میں اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ آشرم میں لے جاؤ۔ آشرم بنائے ہی اس لئے جاتے ہیں۔ تاکہ ریٹائرڈ آدمی کو شانتی دے سکیں۔ اور کچھ نہ دے سکیں۔

●ـــــــ

گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بیوی مندر میں پوجا کے لئے گئی ہوئی ہے۔ ہم دونوں کی بول چال دو تین برس سے بند تھی۔ بلکہ دونوں کو بول چال کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد میں یہ پروگرام بنا رہا تھا کہ بیوی سے تجدید محبت کی جائے۔ کوئی اور کام تھا ہی نہیں۔ تو تجدید محبت کو ایک کام سمجھ کر کیوں نہ اختیار کیا جائے۔

لیکن بیوی سے ایک ٹکنیکل غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تجدید محبت کی بجائے بھگوان کی پوجا کو ترجیح دینا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے بھگوان ریٹائرمنٹ سے پہلے کیوں نہیں آتا۔ بعد میں کیوں آجاتا ہے۔

بہرکیف جب مندر سے لوٹ آئے گی تو اس سے کہوں گا "جانِ من! گمراہی کے راستے پر چل پڑی ہو۔ راہ راست پر آجاؤ۔ اور بھگوان سے کہدو کہ میرا خاوند چونکہ ریٹائر ہو چکا ہے، اس لئے میں اس کی ارتھی تک تجدید محبت کا پروگرام بناؤں گی۔ آپ کی باری ارتھی کے بعد۔"

میرا ننھا پوتا ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اچانک ایک پنسل اس کے ہاتھ سے نیچے فرش پر گر پڑی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر وہ بولا "دادا جان! ذرا تکلیف فرما کر مجھے میری پنسل اٹھا دیجئے۔"

میں نے کہا "نہیں صاحب! اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میں کوئی کام نہیں کروں گا۔"

وہ بولا۔ "ریٹائرمنٹ کیا ہوتی ہے دادا!"

"یعنی کل سے میں دفتر نہیں جاؤں گا۔ میری چھٹی۔"

وہ کم بخت تالی بجا کر بولا۔" ونڈرفل! دادا جی! کل میرے اسکول میں بھی چھٹی ہے۔ کل میں اور آپ دونوں شطرنج کھیلیں گے۔ دیکھ لیجئے گا۔ میں آپ کے بادشاہ کو شہ دوں گا۔" میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ برخوردار میرا بادشاہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہر انسان کے اندر کا بادشاہ مر جاتا ہے۔ اور اُس کا تخت و تاج دوسرے چھین لیتے ہیں۔ لیکن میں اُسے یہ نہیں کہہ سکا۔ حالانکہ ریٹائر آدمی کے باقیماندہ سانس تبھی چل سکتے ہیں۔ جب وہ ننھے منوں کی معصوم سطح پر اتر کر کھیلنا شروع کر دے۔ اگر چھنی ہوئی معصومیت ریٹائرڈ آدمی کے رگ و ریشے میں پھر داخل ہو جائے۔ تو اُس کی خوش نصیبی پھر لوٹ آتی ہے ـــــ ورنہ گزشتہ ہفتے ایک ریٹائر ہونے والے افسر نے دفتر کی چھٹی منزل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔ اور اُس کی جیب سے ایک چٹ نکلی تھی۔" میں خودکشی اس لئے کر رہا ہوں۔ کیونکہ معصوم بچے میرے اندر داخل ہو کر میرا زہر پینا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوتے سے وعدہ کیا کہ کل تمہارے ساتھ کھیلوں گا۔ اور ضرور ہار جاؤں گا۔ کیونکہ میرے ہار جانے سے ہی تمہیں مسرت ملے گی۔ اور مجھے ہار جانے سے ہی مسرت ملے گی۔ یہ سن کر تمھا پوتا اتنا خوش ہوا کہ زمین پر گری ہوئی پنسل فوراً اُٹھا لی۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر ناشتہ کیا۔ کل دفتر جانے کے لئے ناشتہ کیا تھا آج دفتر جائے بغیر ناشتہ کیا۔ ناشتہ معمول کے برعکس زیادہ لذیذ تھا۔ (بیوی سے بول چال شروع کر دی تھی؟) لیکن ایک عجیب سا خلا ر

محسوس کیا۔ کہ ناشتے کے بعد تو مجھے دفتر جانا چاہیئے تھا۔ آج دفتر میں جاؤں گا۔ تو مجھے ایک غیر ضروری آدمی سمجھا جائے گا ــــ تو پھر غیر ضروری آدمی کیا کرے؟ کیا کرے؟ کیا کرے؟ اچانک ایک آئیڈیا سوجھا۔ سوچا، ہری ناتھ بھلّہ کو ٹیلیفون کیا جائے۔ چنانچہ عادتاً "ہیلو" کے بعد کہا "بھلّہ جی! میں آج سے ریٹائر ہوگیا ہوں۔"

جواب آیا "مبارک ہو۔ دوزخ سے نجات ملی۔"

میں نے کہا۔ "مگر اب میری جنت تو تم ہو۔ تم بھی تو ریٹائر ہو چکے ہو۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے غریب خانے پر تشریف لے آؤ۔ آرٹ پر گفتگو کریں گے۔ فلاسفی پر۔ حتیٰ کہ سگریٹ نوشی کے نقصانات پر بھی۔ آجاؤ۔ آجاؤ۔"

بھلّہ نے کہا "بھئی! سالا میرے لئے مکان کی رجسٹری کا جھگڑا ہے۔ آج تو دن بھر اس مصیبت میں مر رہا ہوں۔ سگریٹ نوشی ابھی چھوٹی نہیں اور چار دن بعد سگریٹ کے مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کرلیں گے۔ اور اب عرض یہ ہے کہ بچے بنارہا۔"

مجھے افسوس ہوا۔ بھلّہ جی ابھی ریٹائر نہیں ہوئے۔ مکان کی رجسٹری کی عارضی ملازمت کرلی۔

چنانچہ دوسرے دوست ڈوگرہ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور کہا۔ "پیارے! اب جبکہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں تم آؤ اور مشورہ دو۔ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

وہ بولا "میرے آنے پر لعنت بھیجو۔ اور...... میرے خیال میں تو اب خدمتِ خلق کرو۔"

"خدمتِ خلق کی وضاحت کرو۔"

"ایک ودھوا آشرم کھول لو۔ ودھوائیں عام مل جائیں گی۔"

"کیا اپنی بیوی کو بھی ودھوا آشرم میں داخل کردوں؟"

وہ ہنس کر بولا "یہ تو تمہاری فراخ دلی ہوگی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آدمی کو فراخ دل ہو جانا چاہیئے۔"

ریٹائرمنٹ کے بعد دو تین مہینے بے حد مصروفیت رہی۔ یہ مصروفیت یک طرفہ تھی یعنی یہ مصروفیت میری نہیں تھی۔ دوسروں کی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن دوسرے لوگ مجھے مشورہ دینے آجاتے تھے۔ وہ اپنے شوق کو نیک نفسی کہتے۔ بلکہ یہاں تک ان ڈائرکٹ دھمکی بھی دے جاتے کہ اگر آپ نے میرا مشورہ نہ مانا۔ تو آپ کا مستقبل بے حد تاریک ہو جائے گا۔

بلکہ ایک صاحب آکر ایک دن مشورہ دے کر گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ آج ہارٹ اٹیک سے چل بسے ہیں۔ اور اپنا مستقبل تاریک کر گئے ہیں۔

علی الصبح ایک ٹولی نے آکر میرے گھر کی گھنٹی بجائی۔ میں بالکنی پر ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا نکل آیا اور کہا "فرمائیے!"

"ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ ریٹائر ہو گئے ہیں۔"

"آگے فرمائیے"

"نیچے تشریف لائیے۔ ہماری ٹولی کے ساتھ صبح کی سیر پر چلئے۔ ہر ریٹائرڈ

آدمی کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر اُسے کچھ دن اور جینا ہے تو آج صبح سے سیر پر جانا شروع کر دے۔"

میں نے کہا "اگر آج کی بجائے کل سے جانا شروع کر دوں تو کیسا رہے گا۔"

"کوئی ہرج نہیں۔ مگر پکا وعدہ ہلا جپوتی آن کا۔"

میرے دادا فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا خاندان راجپوتانہ سے بھاگ کر آیا تھا۔ لہٰذا ہم بھی راجپوت ہیں۔ دو صدیوں تک راجپوتی شان کچھ ایک آدھ فی صدی سے زیادہ نہیں بچی رہ سکتی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے راجپوتی وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن صبح کی سیر والی ایک اور ٹولی آئی۔ ہماری کالونی میں ایسی پانچ چھ ٹولیاں تھیں۔ اُن سے بھی جبراً قہراً راجپوتی وعدہ کر لیا گیا۔

تیسرے دن پھر نئی ٹولی آئی۔ اُسے بیوی کے ہاتھوں کہلوا دیا گیا کہ وہ گنگا پار گئے ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ لوٹ آئے، جس کا چانس کم ہے۔ ایک اور رشتے دار تشریف لائے۔ اُن کے مشوروں کی فہرست قدرے لمبی تھی۔ اس لئے ناشتہ بھی کیا۔ لنچ تک قیام کیا۔ اور پھر تنگ آ کر پوچھنے لگے "لیکن بنیادی سوال تو یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیئے۔ لہٰذا یہ بتائیے کہ آپ کون کام کریں گے۔"

میں نے کہا "یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ میرا کام تو عمل کرنا ہے۔ بھگوان کرشن نے گیتا میں یہی کہا تھا۔ چونکہ انھوں نے گیتا پڑھی نہیں تھی۔ صرف اُس کا احترام کرتے تھے۔ اس لئے مجھ سے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ البتہ طیش میں آ کر میری بیوی سے یہ فرما گئے کہ اب میں صرف ان کے جنازے پر آؤں گا۔ اس سے پہلے کبھی نہیں آؤں گا۔"

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا۔ کہ کالونی میں ہر آدمی کو میری ریٹائرمنٹ کے بعد ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ کئی اصحاب تو اسے انسانی ہمدردی تک کہتے تھے۔ ہر آدمی چاہتا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی کام میں ضرور مصروف ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ اچانک اور جلدی انتقال کر جائیں گے۔ اور پھر کسی کام کے نہیں رہیں گے۔ اور سماج ان کی بے پناہ صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گا۔

حیرت ہوتی تھی۔ کہ اگر مجھ میں بے پناہ صلاحیت ہوتی تو مجھے ریٹائر کیوں کیا جاتا۔

غرض میری بہبودی کے لئے مختلف تجاویز جو صرف مختلف نہیں تھیں متضاد بھی تھیں۔ میرے باطن میں ٹھونسی جانے لگیں۔ مثلاً :۔

آپ محلہ سدھار کمیٹی کے پریذیڈنٹ کیوں نہیں بن جاتے۔

آپ گونگے اور بہرے آدمیوں کی ٹریڈ یونین بنا لیجئے۔

کالونی میں گھومتے، ڈرتے ڈرتے کہہ رہے تھے۔ کہ ہمارا کوئی رہنما نہیں بنتا۔ آپ کا ذکر بالخصوص کر رہے تھے۔

کرپشن کے خلاف انقلابی جدوجہد شروع کر دیجئے (یہ تجویز ایک سمگلر نے سمجھائی تھی)

ہر اتوار کو آپ رامائن کی کتھا کیا کیجئے۔ کیونکہ رام کا نام ہی ستیہ ہے۔

پوری کالونی ایک علیحدہ شمشان گھاٹ بنوانے کے لئے۔ آپ کی طرف دیکھ رہی ہے۔

اور چونکہ کالونی کے ہر انسان کو اپنی موت یقینی نظر آتی ہے۔ اس لئے ہر

انسان اپنا چندہ دینے کے لئے آمادہ ہے ـــ مگر کوئی چندہ لینے کے لئے آگے بھی تو آئے۔ بلکہ ایک سیاسی لیڈر نے تو وزارت چھن جانے کے بعد اپنی نئی پارٹی بنا لی۔ اور مجھے اُس کا جنرل سیکریٹری بنانے کے لئے بے چین ہو گیا۔ (پارٹی پریزیڈنٹ وہ خود بننا چاہتا تھا)

ریٹائرمنٹ کے چھ ماہ بعد میرے اندر عجیب کوئی واضح اور مستقل آواز نہیں آئی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ تو ایک دن ناشتے کے بعد میری بیوی نے مجھے کہا۔ "گھر میں آج کوئی سبزی نہیں ہے۔ ذرا مارکیٹ تک جا کر ایک کلو آلو تو خرید لائیے۔"

یہ اُس عورت کی آواز تھی۔ جو تیس برس تک اپنے اصول پر ڈٹی رہی۔ کہ آپ کو سبزی خریدنے کی نہ سوجھ بوجھ ہے نہ سلیقہ۔

دوسرے دن اُس نے درخواست کی۔ کہ ذرا ملک ڈپو کے محلہ میں گھر سے ہو کر دودھ کی دو چار بوتلیں تو لے آئیے (وہ جانتی تھی کہ ملاّ کافی لمبا ہوتا ہے)

تیسرے دن مجھے پڑوسی سے لڑنے جھگڑنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ کہ پڑوسن اپنے گھر کے چوہے ہمارے گھر کی طرف کیوں بھیج دیتی ہے۔

اور چوتھے دن جب میں فروٹ شاپ سے گھر کے لئے انگور خرید لایا تو غصے میں آ کر بیوی سے پوچھا۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ خاوند یا گھریلو ملازم؟"

وہ بولی "خاوند ہی سمجھتی ہوں "

" تو مجھ سے گھریلو سرونٹ والے کام کیوں کروا رہی ہو "

" کیونکہ ہم نے گھریلو سرونٹ کو برخاست کر دیا ہے۔ وہ بڑا بے ایمان تھا۔ بازار سے جو چیز خرید کر لاتا ایک تو اس پر خواہ مخواہ بہت سا ٹائم برباد کرتا پھر گھٹیا کوالٹی کی چیز لاتا اور بد نیتی کے ساتھ ساٹھ پیسے کی چیز کا ایک روپیہ دام بتا دیتا، چالیس پیسے خود ہضم کر جاتا۔ اس لئے ہم نے اُسے جواب دیدیا۔ اچھا کیا نا ؟"

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "اچھا یوں کیا کہ تم نے میری ریٹائر منٹ ختم کرا دی اور مجھے پھر ایک نوکری دلا دی "

میری یہ بات سن کر گھر کے سبھی افراد ہنسنے لگے۔ اور میں رونے لگا۔ مگر اس احتیاط سے کہ میرے رونے کی آواز کوئی نہ سن سکا۔

اور پھر بڑھاپا آگیا

اور بالآخر مجھ پر بڑھاپا آگیا ـــــ اس سے پہلے میرے والد صاحب پر بھی بڑھاپا آیا تھا، دادا صاحب پر بھی آیا تھا۔ پردادا صاحب پر.....؟ مگر ان کے بارے میں افواہ تھی۔ کہ ان پر بڑھاپا نہیں آیا تھا۔ کیونکہ بڑھاپا آنے سے پہلے ہی اپنی بیوی کے باوجود ایک دوسری عورت سے عشق میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور پھر عاشق اور معشوق دونوں نے وصلِ کل کے لئے، دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔

مگر یہ افواہ تھی اور افواہوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے ـــــ اور ویسے ہی میری پردادی نے آخری سانس تک اپنے آپ کو بیوہ تسلیم نہیں کیا تھا۔

میں سوچتا ہوں۔ اپنے بڑھاپے کا ذکر کہاں سے شروع کروں؟

کیا راجہ دشرتھ سے شروع کروں۔ جس نے آئینہ میں داڑھی میں ایک سفید بال دیکھا تھا۔ تو راج پاٹھ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ جو لوگ پولیٹکل سائنس نہیں جانتے۔ صرف اخلاق حسنہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

آئینہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ لیکن مجھے اس میں نہ سفید بال نظر آیا نہ کالا۔ کیونکہ میں نے شیو کر رکھی تھی۔ جو لوگ ہر روز شیو کرتے ہیں ان کا راج پاٹھ محفوظ رہتا ہے۔ میرے راج پاٹھ کی حد دو کمروں والے مکان سے آگے نہیں بڑھی۔ جو میں نے سرکار سے قرضہ لے کر بنوایا تھا۔

گزشتہ دنوں منہ اندھیرے میرے مکان پر دستک ہوئی۔ اور پھر فضا میں ریٹائرڈ ایڈوکیٹ جناب کشن دیال کی آواز ابھری "فکر صاحب! آئیے اب آپ میرے ہمراہ صبح کی سیر پر جانا شروع کر دیجئے۔"

میں فوراً آئینے کی طرف لپکا اور لوٹ کر کشن دیال جی سے عرض کیا "معذرت چاہتا ہوں ایڈوکیٹ صاحب! آپ نے غلط دروازے پر دستک دی ہے۔"

آئینہ واحد چیز ہے۔ جس میں انسان کو اپنے چہرے میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ اس لئے مجھے ریٹائرڈ ایڈوکیٹ کی بجائے آئینہ پر زیادہ بھروسہ ہے۔

اور یا پھر سوچتا ہوں کہ بڑھاپے کا ذکر اپنے ننھے پوتے سے شروع کروں۔ کہ ایک دن اچانک کیا دیکھتا ہوں۔ وہ میری کرسی پر بیٹھا کچھ تحریر فرما رہا ہے۔ میں نے کہا "پوتے حضور! اطلاعاً عرض ہے کہ یہ کرسی میری ہے۔"

وہ بولا۔" نہیں میری ہے۔"

یہ خالص ننگی جارحیت تھی۔ مجھے طیش آگیا۔ جی چاہا، اسے طمانچہ لگا کر

کرسی سے نیچے اُتار دوں۔ تاریخ میں ہر بڑے شہنشاہ نے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں پر اسی طرح قبضہ کیا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا۔ نتھے جہانگیر نے اپنے والد صاحب قبلہ شہنشاہ اکبر کی سرِ دربار داڑھی نوچنے کی گستاخی کر ڈالی تھی۔ اور بچارا اکبر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ تو میں کس گنتی میں ہوں۔

لہٰذا میں نے طیش کو دبا کر حقائق کا سہارا لیا اور پوتے حضور کو تواریخی حوالے دے کر سمجھایا کہ یہ کرسی میری ہے۔ کیونکہ میں اسی کرسی پر بیٹھ کر درجنوں کتابیں اور ہزاروں طنزیہ مضامین لکھتا رہا ہوں۔

وہ پوچھنے لگا " آپ ان مضامین میں کیا لکھتے تھے؟

" سوشلزم کے حق میں لکھتا تھا۔"

" آپ نے لکھ لکھ کر اپنی عمرِ عزیز گنوا دی۔ اب میں لکھوں گا۔"

" کیا تم بھی اپنی عمرِ عزیز گنوانا چاہتے ہو۔؟"

" نہیں، میں سوشلزم کے خلاف لکھوں گا۔"

" بیٹا! ایسا کروگے تو خاندان کی عزت پر بٹہ لگ جائے گا۔ کرسی اور سوشلزم دونوں کا تختہ اُلٹ جائے گا۔"

وہ بولا " لگتا ہے آپ تو بوڑھوں کی طرح مجھے نصیحت کرنے لگے ہیں۔"

یہ سُن کر مجھے ایک زبردست دھچکا لگا۔ مجھے آج تک براہِ راست کسی نے بوڑھا نہیں کہا تھا۔ حتیٰ کہ خود میں نے اپنے آپ کو کبھی نہیں کہا تھا۔ میں نصیحت ضرور کرتا تھا۔ مگر اس پر عمل کوئی نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اسے نصیحت ہی نہیں کہتے

جس پر عمل کیا جائے ۔ مگر چھوٹے اتنا احترام تو ضرور کرتے ہیں کہ سر جھکا کر نصیحت سُن لیتے ہیں اور پھر خاموشی سے چلے جاتے ہیں ۔ بوڑھے کو بوڑھا تو نہیں کہہ دیتے ۔ اس سے بوڑھے میں یہ حسین ریلوژن قائم رہتا ہے کہ وہ بوڑھے نہیں ہیں ——— ایک مرتبہ کا ذکر ہے میں نے سڑک پر دیکھا ۔ ایک بچہ چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر ایک کتے پر پھینک رہا تھا ۔ اور جواباً کتا بھونک رہا تھا ۔

میں نے بچے کو جھڑک کر کہا "نہیں بیٹا! کتے کو پتھر نہیں مارنا چاہیے ۔ رحم کرو اس پر!!

خبردار! اگر اسے پھر پتھر مارا تو ..... "

بچے نے اتراتا کہا ۔ "اب نہیں ماروں گا ۔"

بچے کو یہ جواب معقول نہیں لگا ۔ بلکہ کتے کو بھی معقول نہیں لگا ۔ کیونکہ میں نے دیکھا ۔ کتا میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ جیسے کہہ رہا ہو "عجیب احمق ہو ۔ اگر یہ مجھے پتھر نہیں مارے گا تو کیا پھول مارے گا ۔ بھونکنے سے جو مجھے لذت حاصل ہو رہی ہے ۔ تم نے اس سے بھی مجھے محروم کر دیا ۔

دوسرے دن میں ادھر سے گزرا تو پھر وہی بچہ پھر اسی کتے پر پتھر مار رہا تھا ۔ اور کتا بھونک رہا تھا ۔ اور دونوں بے حد مسرور تھے ۔ بچہ اپنی قوت بازو پر اور کتا بھونکنے کی شدت پر ——— مگر دور سے مجھے آتے دیکھا تو دونوں بھاگ گئے ۔ شاید اس ڈر سے کہ یہ شخص پھر نصیحت کرے گا ۔

اور ادھر میں اس تصور سے سُرخ رو ہو گیا کہ وہ میری برتری تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن برتری کا مطلب بڑھاپا ہرگز نہیں۔ اور یوں بھی کوئی بوڑھا اپنے آپ کو بوڑھا نہیں مانتا۔ ہر بوڑھے کو اپنا اگلا سانس اس خوبصورت مصرع طرح کی طرح لگتا ہے۔ جس پر وہ رقص کرتی ہوئی نئی منزل لکھ سکتا ہے۔ اور میں بھی جب ہر رات کو سوتا ہوں۔ تو سوچتا ہوں کہ کل کی صبح آج سے زیادہ چوق و چوبندا اٹھوں گا۔ اور کسی حسینہ کی آنکھ مجھے اپنا کاجل بنالے گی۔

یہ الگ بات ہے کہ دوسری صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو سب سے پہلے اپنی عینک تلاش کرتا ہوں۔ تاکہ آگتی ہوئی صبح کا دلفریب نظارہ دیکھ سکوں۔ دلفریبی پیدا کرنے والا نظارہ عینک کے بغیر اپنی پوری دلفریبی غائب کر بیٹھتا ہے —— اور پھر عینک کے بغیر اُس حسینہ کی آنکھ بھی نظر نہیں آتی۔ جو مجھے اپنا کاجل بنائے گی۔

میرا خیال ہے۔ بڑھاپا انسان پر بعد میں اترتا ہے۔ بڑھاپے کا احساس پہلے اُترتا ہے۔ اب احساس کی ٹریجڈی یہ ہے۔ کہ اسے بلیک کی کمائی کی طرح آپ خود چھپا چھپا کر رکھ سکتے ہیں۔ بھگوان کرشن کی مورتی کے خفیہ تہہ خانے میں اوجھل رکھ سکتے ہیں۔ لیکن بیرونی عناصر کی آنکھیں ایسی خفیہ کارروائیوں میں یقین نہیں رکھتیں۔ اور وہ آداب و تہذیب کی پروا کئے بغیر حتوا تراحساس دلائے چلی جاتی ہیں کہ آپ ماشاء اللہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔

مثلاً گذشتہ ایک دو برس سے میں محسوس کر رہا ہوں۔ کہ جب بھی کسی حسینہ کا سامنا ہوتا ہے۔ تو میرا کاجل اُن کی آنکھ کی طرف بڑھتا ہے۔

اُن کی آنکھ میرے کاجل کی طرف نہیں بڑھتی۔ بلکہ احترام سے جھک جاتی ہے۔ اور پوچھتی ہے۔ "انکل جی! اب صحت کیسی ہے، سُنا ہے، پچھلے دنوں آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہو گیا تھا۔"

مجھے فقرے کے باقی الفاظ تو اتنا پریشان نہیں کرتے۔ مگر لفظ انکل ضرور کھلتا ہے۔ اور جب لفظ مسلسل کئی ماہ سے دہرایا جانے لگا ہے۔ تو میں چوکنا تو ہو گیا ہوں۔ مگر حسینوں پر اعتبار نہیں آتا۔ اور یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہوں کہ یہ ابھی ناسمجھ ہیں۔ انہیں راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور پھر ممکن ہے، مجھے مزاح نگار سمجھ کر انکل کا لفظ صرف تفریحاً کہہ رہی ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسی ہی ایک ناسمجھ حسینہ سے میں نے کہا۔ "چلو انکل تو خیر ہوا۔ مگر تمہاری آنکھیں ہرنی کی طرح ہیں۔"

وہ بولی۔ "انکل! کالج میں بھی کچھ لوگ مجھے آہو چشم کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کالج کو چھوڑو۔ میں تو کالج سے بھی دو قدم آگے جانے کو تیار ہوں۔ کہ اگر ان آنکھوں میں کاجل کی دھار پڑ جائے۔ تو یہ دو آتشہ ہو جائیں۔"

یہ سُن کر اُس نے زیرِ لب تبسم فرمایا اور پھر بھاگ گئی۔ اور میرے کاجل پینے کی سب حسرتیں بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ لیکن میں پھر بھی لفظ "انکل" کے متواتر استعمال سے اُس وقت تک مایوس نہیں ہوا۔ جب تک ایک دن

میری بیوی کے منہ سے بھی بے ساختہ نکل گیا۔ میں نے کہا "انکل! مجھے آج ڈاکٹر مکرجی کے پاس لے چلئے۔ میرے گھٹنوں کا درد کمبخت جاتا ہی نہیں"۔ اور میرے منہ سے بھی بے ساختہ نکل گیا "رہی وہی آنٹی کی آنٹی! جانتی ہو اس عورت کو بیوی کہا ہی نہیں جا سکتا جس کے گھٹنوں میں درد نہ ہو"۔

وہ مذاق برداشت کر گئی۔ اگرچہ برداشت تو میں بھی کر گیا۔ جب اپنے گھر کی بیوی ہی انکل کہنے لگے تو باہر کی حسیناؤں سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر بقول میرے بزرگ ادیب دوست، راجندر سنگھ بیدی کی بیوی تو چشم دید گواہ ہوتی ہے۔

یہ نعمتیں خدا کی

خدا نے ہوا کی نعمت ہمیں اس لئے عطا کی ہے تاکہ جب ہمیں کھانے کو کچھ نہ مل سکے تو ہوا کھا کر پیٹ بھر سکیں — خدا کا اصول ہے کہ اپنی مخلوق کو کبھی بھوکا نہ مرنے دیا جائے۔

میں نے ایک توندیل شخص کو دیکھا۔ ہسپتال کے ایرکنڈیشنڈ روم میں پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

وہ بولا "میرے پیٹ میں ہوا بھر گئی ہے۔"

ہوا کا یہ ڈبل رول مجھے پسند نہیں آیا۔ مفلس کے پیٹ میں جائے تو اس کی غذا بن جاتی ہے۔ کھاتے پیتے آدمی کے پیٹ میں جائے تو اس کے لئے زہر بن جاتی ہے۔ ہوا کا یہ ڈبل رول ایک فاش غلطی ہے۔ خدا کو اس غلطی کی اصلاح کرنی چاہیئے۔

مگر ہوا کو بنانے میں خدا نے کچھ اور غلطیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً ایک ہوا ہوتی ہے۔ جو صرف جھونکا کہلاتی ہے۔ نہایت نرم اور شیریں ہوتا ہے...... لیکن صرف اُن حسین دوشیزاؤں کے لئے نرم و شیریں ہوتا ہے، جن کے رخسار نرم اور شیریں ہوں ـــ باقی رخسار تو گلے سڑے کیلوں کا پڑا ہوا ایک ڈھیر ہوتے ہیں چاہے جھونکا ہزار بار اُن کے اوپر سے ہو کر گزر جائے۔ کوئی تاثر نہیں چھوڑتا۔ گویا کردار کیلوں کا ہوتا ہے، جھونکے کا نہیں ہوتا۔ خدا اگر مناسب سمجھے تو کردار والے جھونکے پیدا کرے۔

ہوا کی ایک اور قسم جھکڑ ہوتی ہے۔ جو طوفانی رفتار سے چلتی ہے چلتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتی کہ وہ یہ تانڈو ناچ کیوں کر رہی ہے۔ خدا نے اسے غور و فکر کے مادّے سے محروم کر رکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے جھکڑ کے دو مناظر دیکھے۔ جھونپڑیوں کی ایک طویل قطار کھڑی تھی۔ وہ زمین پر ڈھے کر تتر بتر ہو گئی۔ حالانکہ ہر جھونپڑے پر برسرِ اقتدار پارٹی کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔

اور دوسرا منظر یہ دیکھا کہ وہی جھکڑ چلا۔ سڑک کا ایک بھاری بھرکم درخت دھماکے سے ٹوٹ کر نیچے گرا۔ نیچے جاتی ہوئی ایک فیئٹ کار کچل ڈالی۔ کار کو بھی، کار چلانے والے کو بھی۔ بعد میں ایک جانکار سے میں نے پوچھا: "جھکڑ کا شکار کون تھا۔"

"ایک نامی گرامی سمگلر تھا۔"

"کہاں جا رہا تھا؟"

" ایک عبادت خانے میں چڑھادا چڑھانے "

" کس اعزاز میں ۔"

" کل سمگلنگ کے ایک کیس میں اُسے باعزت رہائی ملی تھی "

غرض ہوا نہ سوچتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے نہ پکڑ میں آتی ہے ۔ کیونکہ اُس کا کوئی ٹھوس وجود نہیں ہے ۔ لیکن ایک مرتبہ میں گھر سے نکل رہا تھا میرے ہاتھ میں ایک سو روپے کا کرنسی نوٹ تھا ۔ نوٹ ، اچانک ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ۔ میں اُسے اٹھانے کے لئے جھکا ۔ تو ہوا کی ایک لہر سے وہ آگے بڑھ گیا ، میں آگے بڑھا ، تو ہوا کی اور لہر سے وہ بھی آگے بڑھ گیا ۔ جوں جوں میں بڑھتا ، ہوا کی نت نئی لہر اُسے اور آگے بڑھا لے جاتی —— آخر ایک مرتبہ ایک تیز سی لہر آئی اور نوٹ ، میرے پڑوسی رام جی داس بھگت کے گھر جا پڑا ۔

" ہی ہی ہی " میں نے سیٹھ بھگت سے خفیف لہجہ میں کہا ۔" یہ نوٹ میرا ہے ، ہوا کی لہر سے ادھر آ گیا ہے ۔"

وہ مسکرا کر بولا ۔" ہوا کی لہریں اسے ٹھیک جگہ پر لے آئی ہیں ۔ میں نے آج رامائن کی کتھا رکھوا رکھی ہے نا ؟ یہ نوٹ کتھا واچک کو بھینٹ کرنے کے لئے بھگوان نے ادھر بھجوایا ہے ۔ آئیے ، آئیے ، اندر کتھا میں آ کر بیٹھئے ۔"

میں نے بے بسی سے کہا ۔" مگر یہ نوٹ تو ہوا کی لہروں کی وجہ سے ادھر آ گیا ۔"

قہقہہ لگا کر بولے ۔" ارے باؤلے ہو! ہوا بھی تو بھگوان نے پیدا کی ہے ۔ بھگوان نے ہی حکم دیا تو ہوا کی لہریں کرنسی نوٹ کو ادھر سے آئیں ۔ آئیے ، آئیے ۔ گتھا کی طرف آئیے ، شاعر نے کہا ہے ؎

چلو تم ادھر کو ، جدھر کی ہوا ہو

پانی ——— •

اگر خدا پانی پیدا نہ کرتا تو وہ اپنے لئے مخلوق پیدا نہیں کر سکتا تھا ۔ اور مخلوق کی پیدائش اس کی مجبوری تھی ۔ اور مجبوری کے تحت کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ۔

پانی سے ہم نے دو نمایاں فائدے اٹھائے ۔ ایک تو اس نے اپنی پیاس بجھائی ۔ اور دوسرے ان دونوں کو پیاسا رکھ کر کھ مار دیا ۔ جنہیں ہم پسند نہیں کرتے تھے ۔ دوسروں کو پیاسا مار دینے میں بھی بڑا مزہ ہے ۔ پیاسا مار دینے والوں نے ہمیشہ تاریخ میں نام پایا ہے ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب پانی کی شکل اور رول ایسا ہے تو وہ مختلف برتنوں میں کیوں پایا جاتا ہے ۔ سمندر ، دریا ، ندیاں ، جھرنا ، نالے ، تالاب ، گھر میں پانی کی ٹونٹی ، جس میں سے پانی کبھی کبھی ٹپکتا ہے ، اور عام طور پر اس وقت ٹپکتا ہے ، جب آپ تنگ آ کر سو جاتے ہیں ۔ اور پھر جوہڑ میں بھی پانی ، جس پر میں نے ایک بار دیکھا ، ایک بیل بھی پانی پی رہا تھا ، ایک آدمی پانی کا گھڑا بھی بھر رہا تھا ، اور ایک عورت گندے کپڑے بھی دھو رہی تھی ۔ میں نے باری باری تینوں سے پوچھا ۔ تو وہ

بولے۔ "ہم خدا کی اس نعمت سے فیض اٹھا رہے ہیں۔"

فیض۔آہ۔ بڑے بڑے سمگلر بھی اٹھاتے ہیں جو سمندر کے گہرے پانی میں سمگلنگ کی قیمتی اشیا چھپا لیتے ہیں۔ اور ملکوں کی ایک سو فی صدی اقتصادیات کو صفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایک ملک کے وزیر اعظم کو استعفیٰ دینا پڑا۔ کسی نے پوچھا۔ "آپ کو استعفیٰ کیوں دینا پڑا۔"

اُس نے جواب دیا۔ "سمندر کے پانی کے فیض سے جس نے میری سلطنت کی اقتصادیات کو ڈبو دیا۔" پانی سے اور بھی کئی فائدے ہیں۔ مثلاً ایک حسین دوشیزہ دریا کے پانی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر سکتی ہے۔ کیونکہ اُس کے والدین جہیز نہیں دے سکتے۔ (پانی کا فیض اور ہوتا ہے۔ جہیز کا اور) لیکن ایک پینسٹھ سالہ دائمی علیل بوڑھا بھی پانی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر سکتا ہے۔ پانی، دوشیزہ اور بوڑھے کی عمر کے تفاوت کو نہیں دیکھتا۔ اُس کا اصول ماورائی ہے۔

پانی سے نہایا بھی جا سکتا ہے۔ ایک کافر ادا حسینہ جب نہا کر نکلتی ہے۔ تو سلفے کی لاٹ سی لگتی ہے اور ہر مرد کا جی چاہتا ہے اُس سے شادی کر لے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہوتی ہے۔ گویا پانی بہت بڑے دھوکے دیتا ہے۔ دنیا کی آدھی شاعری اسی دھوکے کا نتیجہ ہے۔

پانی کے ایک مدھم جھرنے کے کنارے ایک بھوی نے دس برس تک بیٹھ کر دھارمک فلاسفی پر ایک بہت بڑا گرنتھ لکھا۔ اور مارکیٹ میں بھیج دیا۔ مارکیٹ نے اُسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ فلاسفی کوئی نئی

نہیں ہے ۔ بلکہ پرانے گرنتھوں کی ایک نقل ہے ۔

نقل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ پرانے گرنتھ بھی اسی جھرنے کے کنارے بیٹھ کر لکھے گئے تھے ۔ پانی کے جھرنے سب ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ اس لئے جھرنے کسی فلاسفی کو اوریجنل نہیں بنا سکتے ۔ پانی نیک و بد کا مکسچر ہے ۔ اس میں فائدے ہیں تو نقصان بھی ہیں ۔ اچھی بھلی چیزوں کو خواہ مخواہ نقصان پہنچا دیتا ہے ۔ باڑھ بن کر آتا ہے، مویشی، گاؤں، کپڑے لتے ۔ انسان اور مکان غرق ہو جاتے ہیں ۔ بادلوں کا طوفانی پانی کئی ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے ۔ کیونکہ بادل بھی سوچتے نہیں، جاہلانہ عمل کرتے ہیں ۔ پوچھا جائے تو کہتے ہیں ہم خشک زمین کو سیراب کرنے کے لئے برستے ہیں ۔ گرتی ہوئی چھت اور سیراب کے الگ الگ مفہوم ہوتے ہیں ۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے خاصے ان پڑھ ہوتے ہیں ۔

آنسو بھی پانی کا ایک روپ ہیں ۔ مگر سُنا ہے انھیں شانِ کریمی چن لیتی ہے اور آنا گیند رُڑھنے کے لئے کسی کو نہیں دیتی ۔ ایک شاعر نے آنسوؤں پر پانچ چھ سو اٹھتر شعر لکھ کر اپنا مجموعۂ کلام شائع کر دیا ۔ جس پر ساہتیہ اکیڈیمی نے اس کو ریوارڈ عنایت کر دیا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شعر اس کی اپنی تخلیق نہیں تھے ۔ بلکہ مختلف شعراء نے قلمبند کئے تھے ۔

چند دن ہوئے ایک صاحب افسردہ خاطر میرے پاس آئے، بولے ۔ "میں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہتا ہوں ۔ مگر پانی نہیں ملتا، کیا کروں ۔ ؟"

اُسے مشورہ دیا گیا۔" ساہتیہ اکیڈیمی کے ممبر بن جائیے۔"

آگ ——— •

گزشتہ دنوں میرے اور آگ کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:۔

"——— محترمہ! ازراہِ کرم ذرا دور ہو کر بیٹھئے، مجھے آپ سے سینک آرہا ہے۔"

" آپ ہی میرے اتنے قریب آکر بیٹھے تھے۔ شاید آپ کو میرے سینک کی ضرورت تھی۔ مجھے تو آپ کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا آپ خود ہی مجھ سے ذرا دور ہو کر بیٹھ جائیے۔"

" لگتا ہے آپ میں انسانیت بالکل نہیں ہے۔"

" انسانیت کیا ہوتی ہے؟ میرے لئے یہ لفظ اجنبی ہے۔"

" یونیورسٹی میں پڑھی ہوتیں تو دُنیا کا ہر لفظ تمہاری رُوح کو بے معنی نہ رہنے دیتا ——— دیکھو، تمہارے تیز تیز سینک سے میرا بدن جل رہا ہے۔ کسی بدن کو جلنے سے بچانا، انسانیت کہلاتا ہے۔ آہ، مگر اتم اس مثبت جذبہ سے محروم ہو۔"

" آپ نے مجھے یہ الزام لگایا ہے کہ میں تمہارا بدن جلا رہی ہوں۔ لیکن معاف کرنا، مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہے، کہ میں تمہیں جلا رہی ہوں۔"

" کیا تمہیں یہ احساس بھی کبھی نہیں ہوا کہ جب سرد برفیلی ہوائیں چل رہی ہوں تو میں تمہاری قربت میں آکر تسکین حاصل کرتا ہوں۔"

" اداس ہوں "

" بڑی ڈل ذہنیت ہے تمہاری۔ اس کے باوجود تمہارے حق میں اتنا پروپگینڈا کیا جاتا ہے۔ کہ تم ایسی ایک زبردست طاقت ہو۔ کہ ایک اشارہ دیتی ہو تو ریل گاڑی کے پورے جھکڑے چلنے لگتے ہیں۔ کیا ان ریل گاڑی کے جھکڑوں سے تمہارا خون کا رشتہ ہے۔ "

" میرا دنیا کی کسی چیز سے خون کا رشتہ نہیں ہے۔ "

" تو پھر دنیا تم سے خون کا رشتہ کیوں پیدا کر لیتی ہے۔ "

" کرتی ہو گی۔؟ مگر خون کے رشتوں کے متعلق میری معلومات ناقص ہیں۔ "

" آپ برا تو نہیں مانیں گی محترمہ! اگر میں یہ کہوں۔ کہ آپ کافی نالائق ہیں۔ "

" میں تو اس وقت بھی برا نہیں مانتی۔ جب توے پر پڑی ہوئی روٹی جل جاتی ہے۔ اور باؤس والف مجھے فحش گالیاں نکالتی ہے۔ "

" لیکن محترمہ! وہی ہاؤس وائف آپ کا تعریفی قصیدہ بھی پڑھتی ہے۔ جب آپ کی کرم فرمائی سے پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اور وہ گلے کے غرارے کرتی ہے۔ "

" گالیاں ہوں یا کرم فرمائیاں! میرے لئے دونوں ایک برابر "

" ایک برابر؟ لگتا ہے، آپ کی یہ سرشت ہے۔ اپنی بدی پہ بھی نازاں! اپنی نیکی پر بھی۔ بہتر ہے، اس دوغلی سرشت میں کچھ ترمیم ہو جائے۔ تاکہ

آپ انسان لگیں۔ انسانوں میں رہ کر آپ میں انسانی حقائق پیدا ہونی چاہئیں۔ کل میں نے دیکھا۔ آپ ایک چھ منزلہ بلڈنگ کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں پھونک رہی تھیں۔ انسان چیخ رہے تھے۔ مگر آپ بے حس نہ حرکت ہو کر اپنا کام کیے جا رہی تھیں —— یہ ایک شرمناک سچویشن تھی۔"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"آہ! آپ کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ ایک نوجوان دوشیزہ اور ایک جوان سال کنوارے کی آنکھوں میں تم طپش بن گئی تھیں۔ اور پھر دونوں کی طپش میں ایک وصال کی کیفیت پیدا ہوئی جس سے وہ جیلا مکھی بن کر ایک دوسرے میں غرق ہو گئے —— میں پوچھتا ہوں، تم وہاں کیوں گئی تھیں؟"

"میں کہیں آتی جاتی نہیں درونِ خانہ ہر ایک کے اندر موجود ہوتی ہوں۔ رضا اُن کی ہوتی ہے کہ وہ مجھے شعلہ بنا دیں۔ رضا اُن کی ہوتی ہے وہ مجھے بجھا دیں۔ وہ ملکوں کی قومیں میرا نام لے کر ہزاروں انسانوں کو پھونک ڈالتی ہیں۔ وہ تہذیبیں ایک دوسرے کو نابود کر دیتی ہیں —— ہاں، یہ رضا اُن کی ہوتی ہے، میری نہیں، میں نے کہا نا؟ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کون میری وجہ سے فنا ہوا اور کون میری وجہ سے عیش و آرام کرنے لگا۔"

"محترمہ! میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں۔ لگتا ہے آپ کا سینک کم ہو گیا۔"

"سینک کم نہیں ہوا۔ آپ کم ہو گئے۔ آپ ذرا میری طرف آگے بڑھ آئیے۔"

"آہ! مجھ میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں رہی۔"

"جس میں خود سکت نہیں رہی۔ وہ مجھ سے تسکین نہیں پا سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"قہ قہ قہ۔ جس انسان کے بے سکت جنازے کو میری بدولت جلایا جا رہا ہوتا ہے، کیا کبھی اُسے احساس ہوتا ہے کہ مجھے جلایا جا رہا ہے۔؟"

"مگر میرے اندر ابھی زندگی کی جوت موجود ہے۔"

"تو پھر میرے قریب آجاؤ، اپنی جوت سے میری جوت اور میری جوت سے اپنی جوت جلا لو، کیونکہ تم میں سے کسی نے کہا تھا، کہ ع

اک جن جائے دوسرا آئے، پھر بھی جوت جلے

مٹی ———•

مٹی بظاہر اتنی حقیر چیز نظر آتی ہے کہ اگر آپ مٹھی بھر مٹی اٹھا کر ایک سگریٹ فروش کے پاس لے جائیں اور کہیں۔ "جناب! اس کے بدلے میں مجھے ایک سگریٹ عنایت کر دیں" تو وہ زیادہ سے زیادہ شرافت برتے گا۔ تو یہ کہہ دے گا "معاف کرو بابا!"

لیکن ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا۔ کہ ایک پوری ہریجن بستی جلا دی گئی ہے۔ پوچھا، کیوں جلا دی گئی بھائی؟ جواب ملا، جلنے والے کہتے تھے، یہ مٹی ہماری ہے جس پہ بستی تعمیر کی گئی۔ مگر جلانے والے کہتے تھے یہ مٹی ہماری ہے، ہریجنوں کو کوئی حق نہیں۔ کہ کسی بھی مٹی کو اپنا سمجھیں۔

چنانچہ کچھ مہینوں بعد بستی کی مٹی پر ایک پوش ہوٹل تعمیر کردیا گیا۔ مٹی پر ہریجن رہیں یا پوش لوگ، مٹی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مٹی کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ میری کوکھ سے جو انگور اُگتے ہیں، اسے وہ لوگ ہی کیوں کھاتے ہیں۔ جو اپنے بنک بیلنس میں انکم ٹیکس افسروں کو دھوکہ دیتے ہیں اور دھوکہ اس لئے دیتے ہیں کیونکہ انکم ٹیکس آفیسر خود دھوکہ کھانا چاہتے ہیں اور نہ زمین کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ غریب بڑھیا عورت جو انگور کا خوانچہ لگا کر بازار میں بیٹھی ہے۔ شام کو گھر جا کر بچوں کو کالی سڑی گندم کی روٹیاں کیوں کھلاتی ہے۔ انگور کیوں نہیں کھلاتی۔

یہ دیکھ کر کبھی کبھی تو لگتا ہے، مٹی بے حس ہے۔ لیکن پھر جب دکھتا ہے کہ مٹی تو ہیروں کو جنم دیتی ہے، گیہوں کی بالیاں، سیب، انار، پھل، پھول، ترکاریاں ــــ سب کچھ اس کے باطن سے اُگتا ہے۔ یہ بے حس کیسے ہوسکتی ہے؟ ایک مرتبہ میں نے مٹی سے پوچھا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے۔ کہ تمہارے اندر معدنیات کے خزانے ہیں۔"

وہ گونگوں کی طرح چپ رہی۔

"آخر تم میں کیا کرامت ہے کہ ہزار ہا جنگجو سپاہی تم پر بمباری کرکے اعلان کرتے ہیں۔ کہ اب تم پر ہمارا قبضہ ہے۔"

وہ چپ رہی۔

"اچھا یہ تو بتادو۔ کہ اگر ہم لادین انسان تمہارے سہارے نہ کھڑے ہوتے تو تمہاری گہری تہوں کے پانی میں ڈوب جاتے۔"

وہ چپ رہی۔

اتنے میں ایک تیکھی آنکھوں والا جوان یہ گنگناتا ہوا نمودار ہوا۔

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اور پھر اُس نے مٹی کے کچھ ذرّے اٹھا کر اپنے ماتھے پر چپکائے۔ اچانک دوسری طرف سے ایک اور نوجوان تلوار لہراتے ہوئے پہلے نوجوان پر جھپٹا اُس کے ماتھے پر بھی مٹی کے ذرّات چپکے تھے۔ میں نے پوچھا "تمہارے ماتھے پر بھی مٹی کے ذرّے ہیں، اُس کے ماتھے پر بھی مٹی کے ذرّے ہیں۔ تو پھر تم لڑتے کیوں ہو۔"

وہ لہرا کر بولا "اُس کے ماتھے پر بھی اُس کے وطن کی مٹی کے ذرّے ہیں میرے ماتھے پر میرے وطن کی مٹی کے ذرّے ہیں۔ اس لئے لڑائی تو ہوگی ہی۔ ذرّے ایک ایسے ہیں تو کیا ہوا؟ وطن تو الگ ہیں۔" ـــــ

غلطی آشو ڈاکیے کی

اچانک میرے ڈرائینگ روم پر دستک ہوئی۔ کال بیل نہیں بجی۔ کیونکہ حسبِ دستور بجلی غائب تھی۔ آدمی ماڈرن دنیا ہو تو دستک، کال بیل سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔

اور پھر دستک کے ساتھ ایک آواز ـــــ "صاحب ڈاکیہ ہوں۔ آپ کا ایک منی آرڈر آیا ہے" آج صبح پڑوسی نرنجن سنگھ سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ اُس نے ایک بڑی گہری ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ وہ ایک سرکاری محکمہ میں وجیلنس آفیسر تھا۔ تین سال سے میرا پڑوسی تھا۔ لیکن اُسے آہ بھرنے کا کبھی موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ بولا "دیکھئے صاحب! کرپشن ایک بھیانک، دیو ہے۔ جو ہم سب کو نگل جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "ایضاً، ایضاً، ایضاً۔"

"میری جایداد کا ایک مقدمہ تھا۔ عدالت کے ریڈر نے کھلے عام مجھ سے پچاس روپے رشوت مانگ لی۔"

"اور آپ نے کھلے عام دے دی؟"

"کیا کرتا جی، مجبوری تھی۔"

اس مرتبہ میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہاں جی، مجبوری بھی سارے ملک کے لئے۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً۔!"

سُنا تھا نرنجن سنگھ بھی رشوت لیتا تھا۔ مگر رشوت دینے والے ٹھنڈی آہ نہیں بھرتے۔ تو پھر نرنجن سنگھ نے ٹھنڈی کیوں بھری تھی۔؟ کیا اس ڈر سے تو نہیں، کہ بھیانک دیو اسے خود بھی نگل جائے گا ــــــ گھر لوٹ کر میں ویجیلنس آفیسر کے متضاد کردار پر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "صاحب آپ کا منی آرڈر آیا ہے۔"

میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ تیس بتیس سال کا ایک ڈاکیہ ایک بچھڑی ہوئی بائیسکل سمیت اور بائیسکل سے بھی پچھڑے ہوئے جسم اور لباس کے ساتھ کھڑا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "ارے بھائی جان! میں تمہارا دو گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے، منی آرڈر کا انتظار! معاف کیجئے یہ علاقہ ذرا وسیع ہے۔ اور میری آج ہی یہاں نئی نئی ڈیوٹی لگی ہے۔ اس لئے قدرے تاخیر ہو گئی۔ معذرت چاہتا ہوں۔ یہ لیجئے، منی آرڈر فارم۔"

میں نے اس کا کندھا شفقت سے تھپتھپایا۔ اور کہا "نہیں پیارے!

مجھے منی آرڈر کا انتظار نہیں صرف تمہارا انتظار تھا۔ کیا نام ہے تمہارا۔؟"

وہ جیسے اُداس لہجے میں بولا "جی لوگ مجھے الیشو، الیشو کہتے ہیں۔ حالانکہ والدین نے میرا نام اشونی کمار رکھا تھا۔"

میں نے کہا "والدین ہمیشہ غلط نام رکھتے ہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ، تمہارے کتنے بچے ہیں ؟"

"تین ہیں جی !"

"اور چوتھا زیرِ غور ہوگا۔ خیر چھوڑو، شام کو جب گھر جاتے ہو تو بچوں کے لیے کیا کوئی پھل لے جاتے ہو۔ کیلا، بگوگوشہ، سیب، انگور..... ؟"

اُس نے بغیر کراہ نکالے کراہتے ہوئے انداز میں سر انکار میں ہلا دیا۔

میں نے پوچھا "اچھا تو ان بچوں کو ان پھلوں کے نام تو آتے ہوں گے ؟"

فخر سے اس کے پچکے ہوئے سینے میں قدرے اُبھار آیا "بالکل آتے ہیں جی۔ اسکول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں نا ؟ نہ صرف پڑھ لیتے ہیں بلکہ لکھ بھی لیتے ہیں ---- اچھا تو یہ منی آرڈر فارم پر دستخط ....."

میں نے بغیر دیکھے بھالے فارم اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور ترنجن سنگھ وحیلنس افسر کی طرح ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "آشو! مہنگائی نے تو بنا رے پتا سے کی کمر توڑ رکھی ہے۔ دودھ پھر مہنگا ہو گیا ہے ؟

"دودھ نہیں صاحب، چائے تک پینا محال ہو گئی ہے۔ خیر جی، یہ تو سرکار کا کام ہے، ہم ڈاکیئے، چپراسی اور بابو کیا کر سکتے ہیں ــــ آپ کا یہ منی آرڈر ڈیڑھ سو روپے کا ہے۔" مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اُس کا کمزور لہجہ کہہ رہا ہے۔ اس ڈیڑھ سو روپے میں میرے بچوں کے لیئے کیلا بھی آ سکتا ہے، سیب بھی بلکہ میں اُن کا والدِ محترم بننا چاہوں تو مارکیٹ سے مکھن کی ٹکیہ بھی لے جا سکتا ہوں۔

ایک دم میں نے پینترا بدلا۔ اور ترش لہجہ میں کہا "آشو! تم کاٹھ کے اُلّو ہو۔"

اُسے طیش نہیں آیا۔ بلکہ مسکرا کر بولا "جی، بالکل یہی بات میری بیوی بھی ہر روز کہتی ہے۔"

"وہ اس لیئے کاٹھ کا اُلّو کہتی ہوگی کیونکہ بیاہ پر جو ساڑھیاں لائی ہوگی وہ پھٹ رہی ہوں گی۔" اُس نے میری بات کا جواب دینے سے احتراز کیا۔ میری صاف گوئی سے بچنے یا اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیئے۔ اور پھر اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ پھٹی ہوئی ساڑھیوں کا تعلق تو کاٹھ کے اُلّو سے ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ نے مجھے کاٹھ کا اُلّو کیوں کہا ــــ لیکن مجھے یوں لگا۔ اُس کی خاموشی نے اُس میں اضطراب سا پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کہا "خیر آشو! کاٹھ کا اُلّو کے الفاظ میرے منہ سے غلطی سے نکل گئے مگر میں جس بات کے لیئے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ...... ؟"

وہ بولا "کاٹھ کے اُلّو سے آپ کو کوئی کام تھا۔"

"ہاں، بہت ضروری ؟ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا ۔ کہ اگر تمہاری دونوں آنکھیں آدھا آدھا دیکھنا شروع کر دیں ۔ تو تمہاری پس ماندگی دور ہو سکتی ہے ۔"

"کیسے جناب !؟"

"یہ جو تم منی آرڈر لائے ہو ۔ کتنے روپے کا ہے ؟"

"ڈیڑھ سو روپے کا تھا ناجی !"

"ہاں، یہ ڈیڑھ سو روپے تمہاری ایک طاقت ہے ۔ حاکمانہ قوت کا مرکز ۔ جیسے چپراسی کا اسٹول ہوتا ہے، کلرک کی فائل ہوتی ہے، افسر کا قلم ہوتا ہے —— لہٰذا تم یوں کرو، کہ اس منی آرڈر فارم یعنی طاقت کے اس منبع کو واپس لے جاؤ، تمہارے سارے مصائب دور ہو جائیں گے"

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔ حالانکہ میں نے کوئی فلسفیانہ گہرائی کی بات نہیں کی تھی ۔ روز مرہ کی چالو بات کہی تھی ۔

میں نے جھنجھلاہٹ میں آ کر کہا ۔ "ابے الو ! نہیں سمجھے ؟"

"جی، آپ غریبوں سے مذاق کر رہے ہیں ۔ میں صرف میٹرک فیل ہوں ۔ اور یہ میری سرکاری ڈیوٹی ہے کہ فارم پر دستخط کروا کے یہ روپے آپ کی نذر کر دوں ۔"

"میں فارم پر دستخط نہیں کروں گا ۔"

"کیوں جناب !؟"

"یو شٹ اپ !"

"مگر جی، یہ تو قواعد ضوابط کے خلاف ہے۔"

میری رگِ تبسم پھڑکی یہ کیا شٹ اپ کہنا قواعد ضوابط کے خلاف ہے؟"

"نہیں صاحب! جب آپ میرے سامنے موجود ہیں۔ تو میں فارم کیسے واپس لے جاؤں۔"

"فارم پر لکھ دو لینے والا انکاری ہے۔ آشو! سرکاری طاقت کے ہوتے ہوئے تم اپنی بے بسی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ جس سے مجھے شرم آرہی ہے۔ تمہارے گرد و پیش میں ہر دوسرا تیسرا آدمی تھوڑی سی سرکاری طاقت کے زور پر بھی، بچوں کو سیب اور انگور کھلا رہا ہے۔ اور تم بیوی کو ایک نئی ساڑی تک خرید کر نہیں دے سکتے۔"

یوں لگا، وہ بوکھلا گیا ہے۔ بولا: تو...... تو...... تو جی قواعد ضوابط کے مطابق مجھے منی آرڈر کی یہ رقم واپس فرستندہ کے پاس بھیجنی پڑے گی۔"

"لعنت بھیجو قواعد ضوابط پر! اور...... اچھا سنو، ایک شرط مانو گے۔ تو میں اس منی آرڈر پر دستخط کر کے روپے لوں گا۔"

وہ میری طرف تعجب اور خوف سے یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، مجھے شرط منظور ہے، آپ فرمائیے۔

میں نے بوجہِ شفقت سے اسے پیاری پیاری تھپکی دی۔ اور کہا: دیکھو آشو! تمہارے پاس طاقت اور اختیار ہے، لہٰذا تم مجھے دھمکی دو کہ اس منی آرڈر کی رقم اس وقت آپ کو دوں گا جب میں ان میں سے پچیس روپے اپنے چائے پانی

کے کاٹ لوں گا۔"

وہ بولا۔ جی، یہ تو پھر.... یہ تو پھر.....؟

"ارے مورکھ! ایک بار کہہ کر تو دیکھو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"لیکن جی! اگر آپ کہہ دیں کہ میں پچیس روپے نہیں کاٹنے دوں گا تو.....؟"

"تو دھمکی بھر دو ــــ کہ روپے کاٹنے دو۔ ورنہ میں فارم پر لکھ دوں گا کہ وصول کنندہ بار بار گھر جانے پر بھی نہیں ملا۔ محکمہ ڈاک آپ کے لکھے کو" اور کے " کردے گا۔ تو اصول ضوابط کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوگی۔

...... اور...... (ارے مگر آشو! تم گھبراتے کیوں ہو۔ وصول کنندہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ کیونکہ اُس کی مجبوری ہے۔ ہر مجبوری سے فائدہ اٹھاؤ، اور بچوں کو مکھن ملائی کھلاؤ۔ سمجھ گئے؟"

اور اس مرتبہ ٹھنڈی آہ آشو نے بھری۔ "مگر صاحب! یہ تو پھر کرپشن ہوگا۔ آپ بھگوان کی قسم کھا کر کہیں، کہ میرے خلاف کرپشن کی رپورٹ نہیں کریں گے۔"

میں نے بھگوان کی قسم یوں بے تکلفی سے کھائی۔ جیسے کئی وزرا اسمگلروں کے ساتھ بے تکلفی سے فوٹو کھنچوا لیتے ہیں۔ اور نہ بھگوان مائنڈ کرتا ہے نہ وزیر۔ اور پھر ایشو ڈاکئے سے کہا۔ "مگر رپورٹ نہ کرنے کی ایک اور شرط بھی ہے۔ جو تمہیں ماننا پڑے گی۔ کہ نہ صرف میرا منی آرڈر بلکہ آئندہ جب بھی کسی کا منی آرڈر لاؤ۔ اُس میں سے اپنی قسمت۔ کے روپے کاٹ لیا کرو گے۔ پھر اس حساب سے کہ جتنے فی صدی مہنگائی بڑھتی جائے اُتنے فی صدی اپنی قسمت کا حصہ بڑھا دیا کرو۔"

وہ ہچکچا کر بولا " مگر صاحب ! یہ تو پھر سو فیصدی کرپشن کہلائے گی۔ حالانکہ میرے والدین نے سکھایا تھا کہ حق حلال کی کمائی ..... ؟"

" ارے حق حلال اور والدین کو مارو گولی۔ آج کی زندگی جو سکھائے، وہی سیکھو۔ اور پھر اسے کرپشن بھی نہیں کہتے، سماج واد کہتے ہیں تم نے سماج واد کے لئے کتنی بار ووٹ دیئے ؟"

" تین بار تو دے چکا ہوں "

" تو پھر تین بار دینے کے باوجود تم چائے کے ایک کپ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ لہٰذا زیادہ باتیں مت بناؤ، کرپشن کو ووٹ دو یعنی ادھر لاؤ منی آرڈر فارم، میں دستخط کر دیتا ہوں، مگر پہلے اپنے حق کے پچیس روپے اپنی جیب میں ڈال لو۔"

اس نے پچیس روپے لرزتے ہاتھوں سے جیب میں ڈالے لیکن جب میں فارم لے کر دستخط کرنے لگا تو اچانک کچھ دیکھ کر رک گیا کیونکہ۔ کیونکہ یہ منی آرڈر میرا نہیں تھا۔ وجیلنس آفیسر نرنجن سنگھ کے نام تھا۔

کلچر پیسے کا

قارئین کرام عُرف ہندی میں پا ٹھک گن!

کل جب میں چائے کا کپ پی چکا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میرے اُس کپ میں راشن ڈپو کی گھٹیا چینی ڈالنا پڑتی ہے، دودھ بھی سرکاری ڈپو سے راشن میں ملتا ہے۔ اور پانی بھی راشن کا تھا کیونکہ واٹر سپلائی والے ایک بوند پانی بطور راشن سپلائی کرتے ہیں ____ بہر کیف چائے پی کر خیال آیا۔ کہ اگر مولانا ابو الکلام آزاد ایسی چائے پیا کرتے۔ تو وزیر تعلیم بننے کی اہلیت سے محروم رہتے۔ ان کے اندر علم و فضل کی کوالٹی فقط اس لیے پیدا ہوئی، کیونکہ ان کی چائے نوشی کی کوالٹی اعلیٰ تھی۔

پھر میں نے اس خیال کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ میں اپنی محبوبہ کے پیپر کو بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا تھا۔ کیونکہ اس کا ہینڈ

رائٹنگ دقیق ہوتا تھا۔ مولانا آزاد عربک اردو کی طرح۔ اور پھر سگریٹ سلگا کر کش لینے لگا۔ یہ سگریٹ امپورٹیڈ تھا۔ یعنی چاندنی چونک دہلی میں تیار کیا گیا تھا۔ کہ اچانک کال بیل بج اٹھی —— اس کال بیل کی آواز نے میرے سگریٹ کے لطف کو ڈسٹرب کر دیا۔ یوں جیسے آپ بیوی کے لبوں پر بوسہ عرض کر رہے ہوں۔ کہ اچانک باہر سے کسی لیبر یونین کے جلوس کا نعرہ گونج اٹھے۔ "مردہ باد! مردہ باد! لے کے رہیں گے! مردہ باد!"

چاندنی چوک براند امپورٹیڈ سگریٹ نوش فرمائیں گے۔ تو کش کا لطف مردہ باد ہی ہو جائے گا۔

اور دوسرے منٹ میں میرے ڈرائنگ روم میں چار پانچ معزز پڑوسیوں کا ایک وفد آکر بیٹھ گیا۔ وفد کے ممبروں کے چہرے بتا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی ودھوا آشرم کے لئے چندہ مانگنے آئے ہیں۔ چندہ دینے کی ٹریجڈی یہ ہے کہ آپ بغیر سوچے سمجھے ادا کر دیتے ہیں "معاف کرو بابا" نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کہا — "فرمائیے!"

اور اُن میں سے جو سب سے زیادہ معزز تھا۔ اور اس لئے تھا کیونکہ اس کی داڑھی باقیوں کے مقابلے پر دو تین انچ لمبی تھی۔ کہنے لگا "جناب! کیا یہ صحیح ہے کہ آپ ہر روز رات کو کھانسا کرتے ہیں؟"

میں نے عرض کیا — "جی ہاں جناب! یہ شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔"

"تو پھر نکالیے پچاس روپے اس شرف کے اعزاز میں۔"

میں ہنس دیا۔ مگر حلق تک ہی ہنسا۔ کیونکہ کئی ہنسیاں جو باہر نکل آتی ہیں، سماج میں ہتک عزت کا سبب بن جاتی ہیں۔ اور پھر سوچا کہ کسی بھی میری اور پچاس روپے بھی میرے۔ تو ایسا مطالبہ کوئی فاترالعقل ہی کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی سو فیصدی فاترالعقل بھی ہو اُسے فاترالعقل کہنے کے لیے جرأتِ رندانہ کی بجائے خاندانی شرافت سے کام لینا بہتر سمجھا۔ اور گزارش کی "مگر پچاس روپے کیوں جناب؟"

"کیونکہ آپ رات کو کھانستے ہیں اور آپ کو کھانسنا نہیں چاہیئے۔"

"لیکن کھانسنا میرا جمہوری اور جسمانی حق ہے۔"

"دیکھئے! آپ کے دائیں بائیں بغل میں دو پڑوسی گھرانے ہیں۔ اور آپ کے بار بار کھانسنے سے ان کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ جب کہ ان کا دعویٰ ہے کہ نیند آنا بھی اُن کا جمہوری اور جسمانی حق ہے۔ لیکن ہمارے ونگ کا فیصلہ ہے کہ پڑوسیوں کی نیند میں خلل اندازی کے عوض آپ پچاس روپے کی PAYMENT کیا کیجئے۔"

یہ کہتے کہتے اُس معزز بڈھے کو کھانسی چھوٹ پڑی۔ بے اختیار میں نے کہا "یہ اس کھانسی کا جرمانہ پانچ روپے۔" مگر یہ بات بھی میرے حلق سے آگے نہیں نکل سکی۔ نجانے میرا یہ حلق ہے یا بلیک ہول۔

میں نے عرض کیا "کیا پچاس روپے دینے کے بعد میں بے محابا کھانس سکتا ہوں۔ اور جرمانے کا یہ ریٹ ایک رات کا ہے یا مہینے بھر کا؟"

" مہینے بھر کا۔ البتہ جب سرکار اپنے ملازموں کا مہنگائی الاؤنس بڑھائے گی۔ کھانسی بھی اسی نسبت سے مہنگی کر دی جائے گی۔"

میں نے ایک بازاری سا اڑنگا لگایا "جناب! پچاس روپے لینے کے بعد انھیں نیند آجائے گی۔"

" آئے یا نہ آئے لیکن پچاس روپے میں ایک طلسم ہے۔ پیسے میں ایک خواب آفریں کیفیت ہے۔ لہٰذا انھیں نیند ضرور آجائے گی۔"

" لیکن پچاس کی بجائے اگر آپ ڈیڑھ سو روپے لے جائیں۔ تو نہ صرف نیند ہی آجائے گی بلکہ خراٹے بھی لینے لگیں گے۔"

میری اس بات پر وہ سبھی ہنس پڑے۔ بلکہ ہنسنے ہی لگے تھے۔ کہ سبھوں کو کھانسی چھوٹ پڑی۔ بہر کیف میں نے یہ سوچ کر کہ شہری تعلقات کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ ہر شہری دوسرے شہری کی خرابی اور خوبی دونوں کا احترام کرے۔ میں نے پچاس روپے نذر کر دیئے۔ اگرچہ تھوڑی سی رعایت ضرور حاصل کر لی کہ جس رات میں بالکل نہ کھانسوں یا کسی رشتے دار یا دوست کے گھر قیام کروں۔ تو اس دن کے روپے، طے شدہ رقم سے کاٹ لوں گا۔ میری یہ تجویز انہوں نے منظور کر لی۔ وفد کے ممبران کافی فراخ دل لگتے تھے۔ اور یوں بھی جس کی جیب میں پیسہ آجائے۔ اُسے مزاج میں فراخ دلی دکھانا ہی پڑتی ہے۔

جب وہ تشریف لے گئے تو میں مسرت سے جھوم اٹھا۔ اور سوچا اب میں رات بھر کھانستا ہی رہوں گا۔ کوئی اعتراض کرے گا تو کہوں گا۔

"جناب! میں قیمت ادا کر چکا ہوں۔ کوئی مفت میں تھوڑے کھانس رہا ہوں۔"

اس عالم نشاط میں ایک گونہ اطمینان بھی ہوا۔ کہ میں اب تک پیسے کی تہذیب کے آنے سے جو خواہ مخواہ مضطرب رہتا تھا۔ اُس اضطرابی عذاب سے جان چھوٹی۔ کیونکہ پیسے کا ایک مثبت پہلو بھی نکل آیا کہ آپ پیسے دے کر بے تکلف کھانس سکتے ہیں، ہنس سکتے ہیں، گالیاں دے سکتے ہیں، دو بیٹ سکتے ہیں۔ کوئی اگر پوچھے "آپ سالے! ادھ کیوں بیسے ہو؟"

اور میں جواب دوں گا "اے سالے! رہنے کے پیسے ادا کئے ہیں۔ تمہیں ٹوکنے کا کوئی حق نہیں۔"

پیسے کا مثبت تصور آتے ہی بیوی کو آواز دی "چھوا نیڈ پپّو اینڈ پپّو اینڈ وغیرہ وغیرہ کی ماں! ذرا ادھر قدم رنجہ فرمایئے۔"

وہ لاج اور سماج کی ماری فوراً حاضر ہوگئی۔ میں نے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کتنے سال ہوگئے۔ میں نے تمہیں گالی نہیں دی، تمہاری پٹائی نہیں کی؟"

وہ تبسم زیرلب ہوگئی۔ ایسا تبسم اُس کے ہونٹوں پر میں نے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ بولی "میرا اندازہ ہے۔ قریباً دس سال ہوگئے۔ اندازہ ایک، آدھ سال غلط یا صحیح بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اندازہ سو فیصدی صحیح ہے۔ اور چونکہ گذشتہ دس برس

سے تم گالی اور پٹائی سے محفوظ رہیں۔ اس محفوظیت کے بدلے میں تم مجھے بطور معاوضہ کچھ نقد رقم ادا کر دو۔"

وہ حیران ہوئی، بولی "آپ کے اس اعلیٰ کردار کا معاوضہ کون دے سکتا ہے۔ بھگوان ہی آپ کو اس کا ثمر دے گا۔"

"بھگوان؟ یہ بیچ میں کون سی بے رنگ اور بے شکل بلا ٹپک پڑی" میں نے جھلا کر کہا "اری! یہ بھگوان شگوان کو چھوڑ، پیسہ ہی آج کل بھگوان ہے۔ دراصل تم عہد قدیم کے اسکولوں میں پڑھی ہو نا؟ اس لئے بھگوان کو ساتھ چمٹائے پھرتی ہو۔ لیکن دنیا میں ایک نئے آفتاب نے طلوع ہونا شروع کر دیا ہے۔ بتا! ایک گالی ایک روپیہ، ایک پٹائی دو روپے۔ لاؤ لاؤ دس سال کا حساب چکتا کر دو۔"

وہ گھبرائی ہوئی ٹیلی فون کی طرف لپکی میں نے بڑھ کر کلائی تھام لی۔ (ہائے! وہ گداز کلائی کہاں مر گئی) "کیا کر رہی ہو؟"

"ڈاکٹر گلاٹی کو بلا رہی ہوں۔ کہ آپ کے حواس کچھ باختہ ......"

ابھی وہ فقرہ مکمل بھی نہیں کر پائی تھی۔ کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ اور کھچڑی مونچھوں والا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہو گیا۔ میں نے پوچھا "فرمائیے!"

وہ بولا "میں لچھن داس ہوں۔ محکمۂ ٹیلیفون کا سپروائزر! کیا آپ کا ٹیلیفون ٹھیک کام کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔"

"برسات کے چار مہینوں میں جب شہر کے پچھتر فی صدی ٹیلیفون ڈیڈ (dead)

پڑے ہیں۔ ان دنوں بھی یہ کبھی ڈیڈ نہیں ہوا۔"

"جی نہیں۔"

"ایک دن بھی نہیں۔"

"نہیں، بلکہ مجھے حیرت بھی رہی۔ کہ یہ کیوں کام کرتا رہا۔"

"تھینک یو!"

"کس بات کی تھینک یو؟"

"سو فی صدی سچ بولنے کی۔ ورنہ صاحب! آج کل کے زمانے میں کوئی ایک فی صدی بھی سچ بول دے تو اُسے دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ تو سو فیصدی ..... مہربانی فرما کر اس فارم پر دستخط کر دیجیے۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک کاغذی فارم میرے سامنے پیش کر دیا۔

"یہ کاہے کا فارم ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ہمارے محکمے نے جاری کیا ہے جناب! ہم سپروائزروں کو حکم دیا ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں تحقیق کرو کہ موسم برسات میں جس جس صاحب کا ٹیلیفون کام کرتا رہا ہے، ان سے ایک سو روپیہ ماہانہ وصول کرو۔ اور اپنی نمایاں اور بہتر کارکردگی کے عوض دس روپیہ سبھی سپروائزر اپنے آپ میں بانٹ لیں۔ مبارک ہو آپ کو۔ کہ آپ کا ٹیلیفون کبھی ڈیڈ (DEAD) ..... میرا مطلب ہے اس خوشی میں نکالیے چار مہینے کے چار سو روپے!"

اور اُس نے میرے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ سلگایا۔ اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے قدرے پریشان ہو کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کا

چہرہ جیسے کہہ رہا تھا ۔ "اور بولو سچ! اے پیسے کی تہذیب کے نمائندے مہاراج ہریش چندرجی!"

فارم ہاتھ میں لئے میں سوچنے لگا ۔

کھانسی پر کوئی پابندی نہیں ـــ پیسے ادا کرتے رہو ۔

بیوی کو گالی نہ پٹائی ـــ پیسے ادا کرو ۔

ٹیلی فون ڈیڈ نہیں رہا ـــ پیسے ادا کرو ۔

یہ نئی اور انوکھی صورت حال جو میرے گرد و پیش پیدا ہو رہی تھی ۔ اس میں بیک وقت آنسو بھی تھے اور مسکراہٹ بھی بلکہ کبھی کبھی تو یہ دونوں ایک دوسرے میں یوں گھل مل جاتے تھے ۔ کہ کسی نااہل حکیم کا بنایا ہوا مکسچر بن جاتے تھے ـــ پیسے کی تہذیب نااہلیت کا مکسچر لگتی تھی ۔ جسے (تشخیص کم غلط ہو یا زیادہ غلط) پینا ہی پڑتا تھا ۔

اور یہ مکسچر میرے حلق سے اترا بھی نہیں تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی ۔ ریسیور اٹھایا ۔ آواز آئی ۔ "کیا آپ خکر تونسوی ہیں؟"

میں نے کہا "تھا کسی زمانے میں ۔ آپ کا اسم شریف؟"

"میں بلبیر ہوں چوروں کی ٹولی کا سرغنہ ۔"

"چشم ما روشن، دل ناشاد ۔ کسی دن ناشتے پر تشریف لائیے"

"ہم چوری میں یقین رکھتے ہیں، ناشتے میں نہیں ۔ جب سے آپ اس مکان میں مقیم ہیں ۔ وہاں کوئی چوری نہیں ہوئی؟"

"جی، یہ میری بدنصیبی ہے ۔ اگر میرے گھر میں چرانے کے لائق کوئی چیز

ہوتی۔ تو چوری بھی ہوتی۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط، وغیرہ!

"اجی، بدنصیبی نہیں، اسے خوش نصیبی سمجھئے۔ ورنہ آج کل کے چور تو حسینوں کے خطوط چرا کر بھی بلیک میلنگ میں فروخت کر دیتے ہیں۔ بہرکیف ہماری ٹولی نے چونکہ آپ کے ہاں کسی بھی چوری سے گریز کیا تو میں چاہتا ہوں کہ اس خوش نصیبی کا کچھ حصہ ہمیں بھی بانٹ کر دیجئے، مثلاً ماہانہ ایک سو روپیہ۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا (خوش نصیبی نہ ہو تو انسان سنجیدہ ہو جاتا ہے)

"قبلہ چور صاحب! اس میں خوش نصیبی کا کون سا پہلو ہے؟"

"کیوں نہیں، ہم چوری کے لیے آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوئے، آپ کو ڈرایا دھمکایا نہیں، آپ پولیس میں رپٹ کرنے سے بچ گئے۔ پولیس تھانے کے چکر پر چکر سے محفوظ رہے۔ جھوٹے گواہ نہیں ڈھونڈنے پڑے۔ عدالت میں جا کر انصاف کے نام پر لٹنے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ اور آپ تسکین کے لمحوں کے ساتھ جیتے رہے۔ ان مصائب سے نجات دلوانے کی قیمت کیا ایک سو روپیہ ماہانہ زیادہ ہے؟"

میں ہچکچایا۔ مگر کہا "ہاں، قدرے زیادہ ہے کیا آپ ادیب جان کر تھوڑی سی رعایت دے سکتے ہیں؟"

"چلئے نوے روپے ہی۔ دیکھئے، اس سے زیادہ رعایت مانگی تو یہ ہماری توہین ہوگی۔ اور ممکن ہے، ہم چوری کرنے پہنچ جائیں۔ ایک گھنٹہ میں ہمارا ایک چور حاضر ہو جائے گا۔ اسے نوے روپے عنایت کر دیجئے۔"

میں نے معذرت چاہی۔ کہ نقد تو مشکل ہے البتہ کچھ کتابیں پیش کر دوں گا۔
مگر چور مجھ سے زیادہ ذہین تھا۔ کہنے لگا۔ " تو پھر ایک سو اسی روپے کی
کتابیں دیجئے گا۔ کیونکہ ادبی کتابیں مارکیٹ میں آدھے دام پر بکتی ہیں۔
ہم نوے روپے میں بیچ دیں گے۔"

قارئین کرام عرصۂ ہنماری میں پا تھک گئی! جی چاہا، گھر سے بھاگ
جاؤں اور جی ٹی روڈ پر بھاگتا چلا جاؤں۔ اور پیسے کے کلچر سے زیادہ تیز رفتاری
سے بھاگوں ــــ لیکن آہ! اچانک اندوہناک خیال آگیا کہ اگر جی ٹی روڈ پر
اپنے کتے کے ساتھ شام کی سیر کرتے ہوئے ریٹائرڈ بھنڈاری صاحب
مل گئے۔ تو کہیں وہ مجھے روک کر یہ نہ کہہ دیں کہ دیکھئے فکر صاحب! آپ
پانچ سال سے شام کی سیر پر ادھر سے گزرتے ہیں۔ مگر میرے کتے نے کبھی
ایک بار بھی آپ کو نہیں کاٹا۔ لہٰذا اس خوشی میں مجھے ڈھائی سو روپے ادا
کیجئے۔ کیونکہ کاٹنے سے آپ کی جو پتلون پھٹ جاتی۔ مارکیٹ میں آج کل
اُس کی قیمت تین سو روپے ہے۔

؟ ؟

سوال :- سیاست دان بننے کے لئے بنیادی ضرورت کیا ہوتی ہے۔

جواب :- عوام کی بے وقوفی۔

سوال :- لومڑیوں کو پہچاننے کا سب سے آسان طریقہ کون سا ہے۔

جواب :- اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیجئے۔

سوال :- پنڈت نہرو کے بعد ہمارے ملک میں دوسرے درجے کے ہی لیڈر نمودار ہوگئے۔ ان سے ہمیں کس وقت نجات ملے گی۔

جواب :- اس کا جواب تو کوئی تیسرے درجے کا لیڈر ہی دے

سکتا ہے۔

سوال:۔ ہمارے محلے کے ایک بہت بڑے بلیک مارکیٹیے کی ایکسیڈنٹ میں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ حالانکہ بلیک کا کام اس کا دماغ کرتا تھا۔ ٹانگ نہیں۔

جواب:۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کرے کوئی بھرے کوئی۔

سوال:۔ میں نے کل ایک کتاب میں پڑھا کہ ہمارے ملک کی ایک چیف منسٹر رات بھر شراب پیتی تھی تو پھر اسے پکڑا کیوں نہیں گیا۔

جواب:۔ وہ جائز شراب پیتی ہوگی۔ پکڑے صرف غریب عوام جاتے ہیں جو ناجائز شراب پیتے ہیں۔

سوال:۔ میں نے ایک مغرور شخص کو کلب میں بیوی کے ساتھ جوا کھیلتے دیکھا۔ جب وہ ساری رقم ہار چکا تو اس نے بیوی کو ہی داؤ پر لگا دیا۔ بیوی کا کیا ردِ عمل ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ بیوی کو مہا بھارت لڑنی چاہیئے۔

سوال:۔ میرے ایک رشتے دار نے دوسری جماعت کے ایک لڑکے سے پوچھا "بیٹے سکول میں تمہاری میڈم کا کیا نام ہے۔" بتائیے اس نے کیا جواب دیا ہوگا؟

جواب:۔ قلم سٹار دیکھا۔

سوال:۔ ایک بھونڈی لڑکی کی شادی ایک لنگڑے آدمی سے کر دی گئی۔ آپ ایسی جوڑی کو کیا نام دیں گے۔

جواب :- نیچرل جوڑی۔

سوال :- ایک نوجوان لڑکی انتہائی حسین بھی ہے اور انتہائی دانا بھی ــــ بتائیے کون لڑکا اس سے شادی کرے گا۔

جواب :- لڑکا تو شادی پر تیار ہو جائے گا۔ لیکن لڑکی نہیں ہوگی۔

سوال :- آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ لڑکے، لڑکی کو بیوی نہیں بلکہ ایک سکوٹر سمجھ کر شادی کر لیتے ہیں تو پھر شادی کے بعد وہ مزید جہیز کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں۔

جواب :- کیونکہ سکوٹر چلانے کے لئے پٹرول کی ضرورت بھی تو پڑتی ہے۔

سوال :- فرض کیجئے، ایک ملک کے حکمران نے تمام سیاسی پارٹیوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا تو بتائیے، سیاست کے بغیر وہ ملک کیسے چلے گا۔

جواب :- چلے گا۔ کیونکہ وہ حکمران اپنی ایک سیاسی پارٹی بنا لیگا۔

سوال :- سیاست دان، بزنس مین، اور بیوروکریٹ۔ ہمارے ملک کے یہ تین بڑے دشمن ہیں، جو لوٹ مار کر کھا رہے ہیں۔ ہمیں ان کی دشمنی سے کب نجات ملے گی۔

جواب :- جب سارے عوام ان کے دشمن بن جائیں گے۔

سوال :- ایک ایکسیڈنٹ میں مجھ زخم خوردہ کا سکوٹر پولیس والے لے گئے۔ مجھے سکوٹر وہ کب واپس دیں گے۔

جواب :- جب آپ انھیں پڑھ دیں گے۔

سوال :- ایک پبلک سکول میں اپنے بچے کو داخلہ دلاتے وقت اسکول نے مجھ سے دس ہزار روپے دان لے لیا۔ اب پچھتا کیوں رہا ہوں۔

جواب :- مت پچھتائیے۔ کیونکہ ؎

دان دیئے دھن نہ گھٹے کہہ گئے داس کبیر

سوال :- دو سال ہوئے مجھ سے ایک صاحب میری بیش قیمت کتاب لے گئے تھے۔ باوجود مسلسل مطالبے کے واپس نہیں کی۔ آخر وہ کتاب اب مجھے کیسے ملے گی۔

جواب :- فٹ پاتھ پر ردی کتاب کے ڈھیروں میں جہاں بورڈ لکھ کر لٹکایا جاتا ہے ۔ "ہر مال ملے گا پچیس پیسے!"

سوال :- ایک صاحب الیکشن میں ایک مرتبہ جیت گئے۔ اس کے بعد تین چار الیکشن لڑے مگر ہر بار ضمانت ضبط کروا بیٹھے۔ بتائیے پہلی مرتبہ وہ کیوں کامیاب ہو گئے تھے۔

جواب :- اس لئے تاکہ بعد میں بار بار الیکشن لڑتے رہیں۔

سوال :- میرے والد صاحب کے پاس پندرہ بھینسیں تھیں مگر میرے پاس صرف ایک بکری ہے۔ آپ بتائیے، اسے کیا کہیں گے۔

جواب :- بھینسوں کی غداری اور بکری کی وفاداری۔

سوال :- شری بچن جی ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ امیتابھ بچن مشہور فلمسٹار ہیں۔ لوگ اس رشتے کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جواب :۔ لوگ تو اب یہ کہنے لگے ہیں کہ بچن جی امیتابھ بچن کے باپ ہیں۔

سوال :۔ لینن نے روس میں مارکسی انقلاب لاکر دکھایا۔ جبکہ کارل مارکس نے کہا تھا کہ مارکسی انقلاب پہلے یورپ کے کسی ملک میں آئے گا۔ ایسا کیوں ہوا۔

جواب :۔ عامل اور عالم میں یہی فرق ہوتا ہے۔

سوال :۔ ایک ڈاکٹر کو مال وزر سمیت پولیس نے گرفتار کرلیا، لیکن بعد میں ڈاکٹر رہا ہوگیا۔ ایسا کیونکر ہوا ہوگا۔

جواب :۔ کیونکہ ڈاکٹر جانتا ہوگا کہ ع

سارا دھن جاتا دیکھیے تو آدھا لیجیے بانٹ۔

میرے دوست کا کتّا

دوست کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں آپ کو سُناتا رہے مگر آپ کی باتیں نہ سُنے۔ کیونکہ اس کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔

دوست کی ایک پہچان اور بھی ہے کہ وہ بالآخر آپ کا دشمن بن جائے۔ اگر وہ دشمن بننے میں کچھ تاخیر کرے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کی بجائے آپ اس کے دشمن بن جائیں۔ اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں کیونکہ دشمنی دو دوستوں کا مشترکہ کاز ہے۔ آپ پہلے دشمن بن جائیں یا وہ، مقصد تو اس مقصد کے کاز کی تکمیل ہے۔

میرے ایک دوست تھے، ایک بار ان کا پالتو ہندوستانی کتّا کسی نووارد حسین کتیا کے ساتھ بھاگ گیا تو سرتاپا اگنی دیوتا بنے عالمِ طیش میں غریب خانہ پر تشریف لائے، بیٹے۔ فکر صاحب! پہلے یہ بتایئے کہ آپ

میرے دوست ہیں یا نہیں ؟"

میں نے تفریحاً کہا کہ "میں تو دوست ہوں ہی ، مگر آپ کی پوزیشن واضح نہیں ہے ۔ خیر چھوڑیئے ، یہ بتائیے ، معاملہ کیا ہے ؟"

انھوں نے کتے اور کتیا کا قصہ سُنایا اور بولے " یہ خالص اغوا کا کیس ہے اور دوست آن باشد کہ گیرد دست راست !"

میں اسے کہنا چاہتا تھا ، یہ رومانس کا کیس ہے ، اغوا کا نہیں لیکن ہر دوست کی پرابلم یہ ہوتی ہے کہ وہ دوست کے سامنے سچ نہیں بول سکتا ۔ پوچھا " آپ کیسے جانتے ہیں کہ اغوا کتے نے کیا ، کتیا نے نہیں کیا ۔ ؟"

وہ بولے ۔ کتیا نے ، کیونکہ وہ گزشتہ دو چار دن سے ہمارے گھر میں آتی ۔ میرے کتے سے سرگوشیاں کرتی اور یہ سرگوشی آخر اغوا بن گئی ۔ ورنہ میرا کتا تو بے حد شریف النفس تھا ۔"

مگر یہ صریحاً غلط بیانی تھی ۔ کیونکہ بھلہ صاحب کا کُتا شریف النفس نہیں تھا ۔ ایک مرتبہ اس نے میری پتلون کے پائنچے کو بغیر معقول وجہ کے تار تار کر دیا تھا ۔ اس کتے سے مجھے نفرت سی تھی ۔ بلکہ مجھے تو بڑی مسرت ہوئی کہ جوزن کتیا اینڈو جرمن فرینڈز شپ کی آڑ میں اسے بھگا کر لے گئی ۔

لیکن مصیبت بھلہ صاحب سے میری دوستی کی تھی ۔ اس لئے میں نے جبراً قہراً دوستانہ لب و لہجہ میں کہا " بھلہ صاحب ! دوست کی خاطر تو میں ہزاروں دستانہ ہزاروں کتیاؤں کو قربان کر سکتا ہوں ۔ آپ حکم فرمائیے ۔"

خوش ہوکر پہلے تو انہوں نے میرے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالا۔ اپنی ماچس نکال کر سگریٹ سلگایا۔ کیونکہ وہ صرف ماچس اپنی جیب میں رکھتے تھے۔ اور پھر بولے۔ "چلئے تھانہ لوہاری گیٹ میں چل کر اغوا کی رپٹ درج کرائیں۔ کیونکہ تھانیدار آپ کا دوست ہے۔"

میں نے تھانیدار صاحب کو ٹیلی فون کیا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے بولے۔ "فکر صاحب! آپ تو کافی احمق ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں تو احمق ہوں ہی۔ لیکن دوسرے لوگ مجھے احمق نہیں مانتے۔"

تھانیدار نے جواب دیا۔ "تو پھر اپنے دوست بھلا صاحب سے کہہ دیجئے کہ وہ بھی احمق ہیں کیونکہ تعزیرات ہند میں کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے کہ کتے اور کتیا کے بھاگنے پر اغوا کا کیس درج کیا جائے۔ اور پھر سنیئے، آپ کے بھلا صاحب کی طرح ایک اور احمق بھی ہے۔ جس نے صبح آکر بالکل ایسے ہی ایک اغوا کی رپورٹ لکھنے کے لئے کہا تھا۔ کہ میری امپورٹیڈ جرمن کتیا کو، کوئی ہندوستانی کتا اغوا کر کے لے گیا ہے اسے تلاش کر دیجئے۔

قہ قہ قہ۔۔۔ یہ بات بھی بھلا صاحب کو بتا دیجئے۔"

میں نے یہ بات بھلا صاحب کو نہیں بتائی۔ بلکہ یہ کہہ دیا کہ تھانیدار صاحب وعدہ کرتے ہیں، کہ آج شام تک کتا آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔

اس خوشی میں بھلا صاحب نے میرے پیکٹ سے ایک سگریٹ نہیں نکالا، بلکہ پورا پیکٹ جیب میں ڈال کر چلے گئے۔ یوں جیسے یہ میرا پیکٹ

نہ ہو، ان کی ماچس ہو۔

شام کو ان کا ٹیلی فون آیا کہ کتا ابھی تک نہیں پہنچا۔

میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

دوسری شام پھر ٹیلی فون آیا "کتا ابھی تک غائب ہے۔"

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

تیسری شام ٹیلی فون آیا "کتا آج گھر لوٹ آیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

وہ بولے۔ "کیوں؟"

میں نے کہا "اس نے میری پتلون کے دونوں پائنچے پھاڑ ڈالے تھے۔"

وہ بڑے تفریحی موڈ میں بولے "اجی، پتلون کی پرواہ مت کیجئے، پتلون تو مارکیٹ سے نئی بھی خریدی جا سکتی ہے، مگر ایسا وفادار کتا مارکیٹ سے نہیں خریدا جا سکتا۔ بہرکیف آپ میرے دوست ہیں۔ کتا نیا آپ کا دوست ہے، دونوں کا شکریہ! مگر سنیئے، میرا کتا تو اب پتلون پھاڑنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ کسی نے مار مار کر اسے زخمی کر دیا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا، ہٹلر زادی سے عشق کرے گا تو زخمی ہو گا ہی۔

میں نے تو بھلر صاحب سے یہ بھی نہیں کہا کہ آپ ایسے کتے کو کیسے وفادار کہہ سکتے ہیں، جو صرف صنفِ نازک کی آنکھ کے ایک اشارے پر آپ کو دغا دے کر بھاگ گیا۔

دو تین ہفتے بعد میں کچا گوشت بیچنے والے رحیم خان کی دکان پر گوشت خریدنے گیا تو رحیم خان نے کہا "ذکر صاحب! آپ سے ایک شکایت ہے۔"

میں نے کہا "شکایت کوئی بھی ہو، میں شرمندہ ہوں۔"

وہ بولے "نہیں، نہیں، سنیئے تو! ایک مسٹر بھلّہ ہیں۔ وہ آپ کے دوست ہیں کیا۔؟"

میں نے کہا "بھلّہ ہو یا کوئی ہو، میں شرمندہ ہوں۔"

رحیم خان نے کہا "نہیں جی، میں آپ کو شرمندہ کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ دراصل آٹھ دس دن پہلے ایک سیاہ رنگ کا کتا ہماری دکان پر آیا۔ اس کے گلے میں ایک پٹہ لگا ہوا تھا۔ جس پر مسٹر بھلّہ لکھا تھا مجھے کسی نے بتایا کہ وہ مسٹر بھلّہ آپ کے پکّے دوست ہیں۔"

میں نے پوچھا "مگر اس کتّے نے کیا حرکت کی۔"

"اجی! اس نے حرام خوری کی ہے۔ بڑا خوفناک جھپٹا مار کر ہماری دکان سے ایک کلو بھر گوشت منہ میں دبایا اور بھاگ گیا۔ میرے دو چار آدمی اس کے پیچھے بھاگے۔ اور نہ صرف اس کمینے سے گوشت چھین لیا بلکہ ڈنڈے مار مار اسے گھائل بھی کر دیا۔ اور پھر جو بھاگا تو ہم سمجھے کہ راہِ راست پر آگیا ہے۔ مگر دیکھئے نا ذکر صاحب! آپ کے دوست کا کتا، اور ایسی جارحانہ حرکت کرے۔ آپ کو ایسے دوست پر شرمندہ ہونا چاہیئے۔"

میں دوست کی خاطر شرمندہ ہوا۔ اور پھر اپنی معلومات میں اضافہ کے لئے پوچھا۔ "رحیم خاں کیا وہ کتا اکیلا تھا۔؟"

وہ بولا۔ "ارے نہیں جی، کوئی بدلشی کتیا تھی شاید۔ جسے کھلانے کی خاطر اس نے ہمارے گوشت پر حملہ کر دیا تھا۔ لیکن جب ہم کتے کو ڈنڈے مار رہے تھے تو وہ سالی اتنی چالاک نکلی کہ آنکھ بچا کر قریب کی ایک گلی میں گھس گئی اور پھر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

بھانت بھانت کے لوگ

رادھوجانی ـــــ

اپنے والد صاحب سے خاصے مختلف ہیں۔ والد صاحب طوالعفوں کے رسیا تھے۔ جوا خانے میں جانا اُن کی کمزوری تھی۔ جس دن جوئے میں ہار کر آتے، شراب ضرور پیتے تھے ۔ اُن کے دھاگے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ خاصی خوشحال زندگی گزاری۔

مگر رادھوجانی اتنے شریف الطبع ہیں کہ حسین سے حسین تر عورت ان کے پہلو سے گزر جائے، لیکن انہیں علم نہیں ہوتا۔ اپنی بیوی کے سوائے دُنیا کی کسی عورت کو حور نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اسی حور کی برکت سے چھ بچے پیدا کئے۔ تین فیملی پلاننگ سے پہلے تین بعد میں۔

جب بھی کسی عبادت خانے کے سامنے سے گزرتے۔ ہاتھ جوڑ کر

سرِ تسلیم خم کر لیتے ۔ چھوٹی چھوٹی جائیداد یں بیچنے اور خریدنے کی دلالی کرتے سودے میں فائدہ ہو یا نقصان ۔ عبادت گھر کے سامنے تعظیم کا سر ضرور جھکا دیتے ۔ مندر، مسجد اور گوردوارے میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے ۔ کہا کرتے ہیں ۔ نجانے کون سے عبادت خانے کا خدا کب مہربان ہو جائے ۔ اس اعتبار سے بڑے سیکولر تھے ۔ یوں جیسے سیکولرازم کی دلالی سمجھتے ہوں ۔

سال میں ایک آدھ بار صرف دھارمک فلم دیکھ لیتے ہیں ۔ تھیوری ان کی یہ ہے کہ فلمیں انسان کا اخلاق بگاڑ دیتی ہیں ۔ ایک مرتبہ ایک دھارمک فلم میں ہیرو اور ہیروئین کو ایک دوسرے سے عشق کرتے دیکھا، تو دھارمک فلموں سے بھی توبہ کر لی ۔

کوئی ایسا کارنامہ کرنے کو ہمیشہ جی چاہتا ہے، تاکہ تاریخ میں کوئی نام پا سکیں ۔ مگر پچاس سال کی عمر ہو گئی ۔ ابھی تک کسی کارنامے نے انہیں اپنے قابل نہیں سمجھا ۔ لہٰذا تادمِ تحریر شریف الطبع ہی چلے جا رہے ہیں ۔

شوبھنا دیوی ــــــ

ایم ۔ اے پاس ہیں مگر ایک پرائیویٹ سکول میں تیسری جماعت کو پڑھاتی ہیں ۔ تیسری جماعت کی ایک لڑکی جوان ہو گئی ۔ تو اُسے اپنی بہو بنا لیا ۔ اپنے سے دہری عمر کے، ایک آدمی سے شادی کی ۔ کہتی ہیں ۔ اس قسم کی قربانی کے لئے خدا صدیوں میں ایک آدھ بار کوئی عورت پیدا کر دیتا ہے ۔ مجھے پیدا کرنے میں میرے ماں باپ کے علاوہ خدا کا بھی ہاتھ ہے ۔

نان سٹاپ گفتگو کرتی ہیں ۔ کسی نے انہیں کہا اگر آپ پارلیمنٹ کی

ممبر بن جائیں، تو پوری پارلیمنٹ کے چھکے چھڑا دیتیں۔ مگر اُن کا خیال ہے کہ مجھے سیاست دان اور بے ایمان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ویسے سکول ہو یا محلّے والے سبھی شوبھنا دیوی کو علم و دانش کی پتلی سمجھتے ہیں۔ ہر مسئلے پر شوبھنا دیوی سے ہی رائے لیتے ہیں۔ اس لئے کہتی ہیں میری پچاس فیصدی رائے تو شاید میری دانش مندی کے باعث صحیح نظر آتی ہے مگر پچاس فیصدی کام تو خود بخود پورے ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ کا کریڈٹ مجھے مل جاتا ہے۔

ایک دن میں نے مذاق مذاق میں کہا: "شوبھنا دیوی جی! آپ نے بہو کو مٹی کے تیل سے ابھی تک نہیں جلایا۔ آخر کیوں؟"

وہ بولی: "میں تو تیار ہوں۔ مگر میرا وہ منحوس بیٹا نہیں مانتا۔ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے اور میں اس کے باپ کی عزت انتقال کے بعد زیادہ کرتی ہوں۔"

یہ بات کہتے کہتے وہ رونے لگیں۔ پھر ٹھٹھا کا مار کر ہنسنے لگیں۔

میرا خیال ہے شوبھنا دیوی دوسروں کے لیے جینے کی اوٹ میں دراصل اپنے لیے جی رہی ہیں۔

ایم سلیمان عباسی ــــــ

شاعر ہیں۔ اگرچہ اشعار میں گھسی پٹی باتیں دہراتے ہیں لیکن دبنگ آواز میں چونکہ شعر پڑھتے ہیں۔ اس لئے سامعین ڈر کے مارے داد دیتے ہیں۔ سنا ہے ان کے دادا بھی ایسے شاعر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب

نے اُن کے ایک ایک شعر پر داد نہیں دی تھی: تو اُسے اتنا پیٹ ڈالا تھا کہ سالے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

دُنیا کے کئی شاعر کلائی کی ہڈیوں کے سہارے مقبول ہو گئے ہیں۔

ہندو گھرانے کی پیداوار ہیں۔ جوانی میں عشق کر بیٹھے۔ عشق کے بعد یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ محبوبہ تو مسلمان نہیں ہے۔ بڑے گھبرائے کہ محبوبہ چھوڑی تو شاعری بھی چھوڑنا پڑے گی۔ اس لئے مذہب چھوڑ دیا۔ اور مسلمان بن گئے۔ کہتے تھے کہ عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جبکہ سبھی مذہب عشق کے زیرنگیں ہوتے ہیں۔

ہر شاعرے میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ مدعو نہ کیا جائے تو مشاعرے کو منتشر کر دیتے ہیں۔ مشاعرے کے منتظمین سمجھتے ہیں کہ اگرچہ اُن کے اشعار سے فنِ شاعری میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ لیکن مشاعرہ تو منتشر ہونے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ انتشار کرنے میں بڑے ایکسپرٹ مانے جاتے ہیں۔ اس کا اعتراف بڑے بڑے سرکاری افسر اور لیڈر تک کر چکے ہیں۔ کئی افسروں اور لیڈروں کے ساتھ ایسی فوٹوئیں کھچوا چکے ہیں، جن کا علم خود افسروں اور لیڈروں کو بھی نہیں ہے۔ ایم۔ سلمان ان فوٹوؤں کی بدولت لوگوں سے کئی کاروبار کر چکے ہیں۔

اُن کی بیوی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں مگر وہ پھر بھی اُن کے شعروں کی داد دیتی ہیں۔ اس خدشے سے کہ کسی دن اُن کے اندر کا دادا جاگ پڑا، تو مجھے بھی منتشر نہ کر ڈالیں۔

دولت رام بھانڈے والا

دولت رام کے ساتھ بھانڈے والا کا لفظ کیسے جڑ گیا کوئی نہیں جانتا، کیونکہ وہ بھانڈے برتن کی دکان نہیں کرتے۔ سرکاری فیئر پرائس شاپ پر ملازم ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ بیس سال تک وہاں ملازمت کے باوجود ایمان اور دیانت داری کے ساتھ کیسے کام کر رہے ہیں۔

ایک افواہ ہے کہ اُن کے پردادا سب کا بھانڈا پھوڑنے میں طاق تھے۔ اس لئے ان کی فیملی، بھانڈے والی فیملی مشہور ہو گئی۔ مگر تاریخی طور پر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دولت رام کے پاس شجرہ نسب موجود نہیں ہے۔ گنگا تیلکے پانڈے کی دستاویز میں بھی اُن کی بھانڈے والا کی ذات خالی پائی گئی۔

دولت رام بڑے نارمل انسان ہیں۔ ایک گھر، ایک بیوی، چار بچے اور محنت کی کمائی اور کوئی اور مخصوص صفت اُن میں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ بولا کرتے آہ بھرتے ہیں کہ لڑکپن میں بڑے سُر تال سے بھجن گایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی آج کل بھی انھیں بھجن سُنانے کے لیئے کہا جائے تو گا دیتے ہیں۔ مگر سُر تال غائب ہو چکے ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا "دولت رام وہ سُر تال کہاں گیا؟"

بولے "ارے، دیکھتے نہیں کتنی مہنگائی اور کرپشن ہے۔ وہ سبھی سُر تال کاٹ کر کھا گئی ہے۔"

الہ دین کی دیوالی

الہ دین ایک کلرک تھا۔ اس کے والد صاحب بھی کلرک تھے۔ الہ دین کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ کلرک بن گیا، چپراسی نہیں بن سکا۔ حالانکہ وہ یہ دیکھ کر سرد آہ بھرتا ہے کہ چپراسی مجھ سے زیادہ کماتے ہیں۔ چاہے مرتبہ گھٹیا رکھتے ہیں۔ الہ دین صرف اس لئے کلرک بنا تھا کہ مرتبہ نہ گھٹے، والد صاحب کی عزت کو بٹّہ نہ لگے ۔۔۔ وہ دیوالی سے ایک دن پہلے کی تاریخ تھی۔ اس دن حسبِ معمول بجلی بند تھی۔ صبح کے اخبار میں جن کالونیوں میں بجلی بند رہنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان میں الہ دین کی کالونی کا نام نہیں تھا اور یہ اکثر ہوتا تھا کہ جن کالونیوں کا نام چھاپا جاتا تھا ان میں بجلی چالو رہتی تھی۔ ان کی بجائے دوسری کالونیوں میں بند رہتی تھی۔

الہ دین کو بڑا طیش آیا۔ طیش تو ویسے ہی اُس وقت سے چلا آ رہا تھا،

جب اُسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک کلرک کے گھر پیدا ہوا ہے۔ وہ گھر جس کی ہر شے میں تاریکی ہے۔ لیکن آج بجلی کی تاریکی پر اس کا طیش شدید ہو گیا۔ جیسے چیخ کر بولا "اری او حسنے، اتسنے، عکرمے کی ماں کہاں مر گئی تو ؟"

جواب آیا "میں تو آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ اندھیرا ہے تو کیا ہوا، ذرا من کی آنکھیں کھولو۔ بیوی نظر آجائے گی۔"

"اری بیوی کو مار گولی۔ پیٹ کے اندر کچھ کھانے کو گیا ہو تو من میں روشنی کی کرن بھی پیدا ہو۔ جا کر اندر سے کوئی موم بتی لے آ۔"

"موم بتی نہیں ہے۔"

الہ دین کی بیوی کو جہیز میں ایک پیتل کا چراغ ملا تھا وہ اُسے یوں سنبھال کر رکھتی تھی کہ جب کبھی میرے خاوند کا انتقال ہوا تو چراغ سے ہی شوہرانہ روشنی حاصل کیا کروں گی (اور ہندوستان میں خاوند کا انتقال ہمیشہ بیوی سے پہلے ہوتا ہے) چنانچہ اس وقت خاوند کی دردناک حالت دیکھ کر وہ وہی چراغ اٹھا لائی اور بولی "پندرہ سال ہو گئے اب ذرا میلا ہو گیا ہے۔"

الہ دین نے کہا "تمہارے ساتھ جو رہے گا وہ میری طرح میلا ہی ہو گا۔ ادھر لاؤ میں اسے ذرا چمکا دیتا ہوں۔"

چنانچہ الہ دین اُس چراغ کو لے کر پانی کے نل کے پاس بیٹھ گیا اور رگڑ رگڑ کر میل اُتارنے لگا کہ اچانک رگڑنے سے زمین روشن سی ہو گئی اور ایک دہشتناک طویل القامت دیو نمودار ہوا اور بولا "اے الہ دین! آپ میرے آقا! میں آپ کا غلام! جو حکم دیں گے تعمیل کروں گا۔"

الہ دین کی بیوی کانپ اٹھی۔ سراسیمگی میں بولی "تعمیل کرو۔ اور میرے خاوند کو چھوڑ کر دفع ہو جاؤ۔"

دیو گونجیلی آواز میں بولا۔ "یونٹ آپ! تم الہ دین نہیں ہو۔ کیسے کو آئیٹ؟"

الہ دین حیران ہوا کہ یہ دیو تو انگریزی بھی جانتا ہے۔ ایٹمی زمانے کا دیو ہے نا؟ اس نے لڑکپن میں الہ دین کے چراغ اور دیو کی کہانی پڑھی تھی۔ ممکن ہے یہ دیو بھی ویسے ہی کارنامے کر سکتا ہو۔ میری بیوی تو احمق اور ان پڑھ ہے۔ اگر دیو ایک بار دفع ہو گیا تو...... تو......

فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ دیو کو کونسا حکم دے؟ وہ کلرک تھا۔ وہ عمر بھر حکم ماننے کا عادی رہا تھا۔ حکم دینے کا نہیں۔ وہ جیسے تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچ رہا۔ اتنے میں دیو نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "صرف پچاس سکنڈ، اور میرے مالک! اس کے بعد میں لوٹ جاؤں گا۔"

الہ دین گھبرا گیا۔ سردیوں میں بھی ماتھے پر پسینے کے دو قطرے نمودار ہوئے۔ مگر بیوی نے اُسے پیٹھ پر مکہ مار کر کہا "کہو دو جلیبیاں اور مٹھائی لے آئے کل دیوالی ہے۔"

الہ دین کے منہ سے بمشکل نکلا۔ "مٹھائی، جلیبی لاؤ۔ پیشگی شکریہ۔" ایکا ایکی دیو زمین میں دھنس گیا۔ میاں بیوی کی جان میں جان آئی۔ لیکن پھر چار پانچ سیکنڈ بعد دونوں نے ایک دوسرے سے کہا "ہم دونوں عاقل

ہیں۔ موم بتیاں مانگیں، نہ پیلے نہ چاندی کا روپیہ، نہ اپنے لئے ساڑھی نہ تمہارا سوٹ، بچوں کی نیکریں، جرابیں۔ کتنا نادر موقع تھا، کھو دیا۔" میری بیوی بولی "تم بس نرے کلرک کے کلرک ہی نکلے۔"

اللہ دین نے کہا۔ "اور تم بھی نری کلرک کی بیوی نکلیں۔"

دونوں نے فیصلہ کیا کہ جلدی، جلدی مطلوبہ اشیاء کی ایک فہرست تیار کرلی جائے۔ جونہی دیو آئے اسی کے ہاتھ میں فہرست تھمادی جائے۔ کہ یہی اشیاء (جتنی زیادہ سے زیادہ تم اٹھا سکو) فوراً لے آؤ۔ لیکن گھر میں اندھیرا تھا، کاغذ اور قلم کیسے ملتا۔ اللہ دین کی بیوی جلدی سے پڑوس کی چھوٹی دیوار پھاند گئی (پھاندنے میں گھٹنا بھی چھل گیا) اور بڑی منت سماجت سے اس سے ایک چھوٹی سی موم بتی لے آئی۔ اور وہ ابھی فہرست لکھ ہی رہے تھے کہ زمین پھر شق ہوئی۔ خوفناک دیو پھر نمودار ہوا! اور بولا۔ "سوری مالک! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ کتنے کلو مٹھائی اور کتنے کلو جلیبیاں لے آؤں۔؟"

اس مرتبہ اللہ دین گرجا۔ "بڑے جاہل ہو مسٹر غلام۔"

دیو بولا۔ "صاحب! ایم۔ اے کی ڈگری لے چکا ہوں۔ چونکہ تھرڈ ڈویژن تھا، ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے ذریعہ نوکری نہیں مل سکی۔ مجبوراً دیو بننا پڑا۔"

اللہ دین نے کہا۔ "اچھا کوئی بینک لوٹ کر لا سکتے ہو۔؟"

"لا سکتا ہوں۔"

"کیسے۔؟"

" آج کل خونخوار دیوزادوں کا یہ عام وطیرہ ہے ۔"

الہ دین پہلے تو چونک اٹھا۔ پھر افسردہ ہو گیا۔ اگر بینک سے لوٹے ہوئے لاکھوں روپے یہ دیو میرے گھر دے گیا تو پولیس کہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے گھر نہ آ جائے۔ اس دیو کو کون پکڑے گا۔ یہ تو زمین شق اور پھر گم۔

چنانچہ بینک کا ارادہ الہ دین نے ملتوی کر دیا اور اشیاء کی فہرست دیو کے ہاتھ میں دے کر بولا ۔ " دیکھو " یہ سب اشیاء پندرہ منٹ میں میرے گھر پہنچ جانی چاہئیں ۔ "

دیو نے فہرست پر نظر دوڑائی اور کہا ۔" یہ کون سی بھاشا میں لکھی ہوئی ہے ۔ مجھ سے تو پڑھی نہیں جاتی ۔"

الہ دین بولا ۔" ارے یہ اُردو زبان میں لکھی ہوئی ہیں ۔ باقاعدہ کانسٹی ٹیوشنل زبان ہے ۔ تم عجیب نالائق دیو ہو۔ کانسٹی ٹیوشن والی زبانیں بھی نہیں جانتے ۔ پڑھے لکھے ۔ اسے پاس بنے پھرتے ہو ۔"

یہ کہتے کہتے الہ دین کو جو غصہ آیا تو اس نے دیو کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ جس سے اس کی نیند کھل گئی ۔ کیونکہ طمانچہ اس نے اپنے ہی رخسار پر مارا تھا۔ سامنے ہی بیوی کھڑی تھی جو کہہ رہی تھی ۔" اٹھو! بازار میں جا کر بچوں کے لئے پتاشے تو لے آؤ۔ تھوڑے تھوڑے سے لے آنا ۔ سنا ہے سالے بڑے مہنگے ہو گئے ہیں ۔"

دھرم کرم شاہ

دھرم کرم شاہ ـــــ سوسائٹی میں ایسے ناموں کی روایت نہیں ہے۔ لیکن کسی دانا نے انہیں سمجھایا کہ روایت شکنی کی جائے۔ تو سوسائٹی صرف انہیں ہی تسلیم کرتی ہے۔ دانا اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اس لئے سوسائٹی میں کچھ نورہیرا کہلاتے ہیں۔ کچھ نورہیرا ابھی اقلیت میں تھا۔

دھرم کرم شاہ۔ خاندانی طور پر نہ شاہ تھے نہ گرا۔ ان کے والد صاحب کے پاس حقہ ہوتا تو تمباکو نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا تمباکو دکاندار سے اُدھار مانگ لاتے۔ اُدھار ادا نہ کر پاتے، مگر دکاندار کے سامنے سر تسلیم خم کرکے کہا کرتے "مجھ پر قرض واجب الادا ہے۔ چکادوں گا۔ چاہے قیامت میں چکانا پڑے۔" جو آدمی شاہ ہوتا وہ شریف النفس ضرور ہوتا ہے۔ مگر دھرم کرم شاہ شریف النفس نہیں تھے کیونکہ روایت چاہے خاندان

کی ہو چاہے قوم کی، اُسے توڑنے میں یقین رکھتے تھے۔ بدقسمتی سے، (بدقسمتی عوام کی) ایک مرتبہ اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ ایک غریب عورت نے اُن سے التجا کی کہ میرے لڑکے کو نوکری دلوا دیجئے۔ دہشت بھری آواز میں غرّائے۔
"کیا نوکری میری جیب میں رکھی ہے کہ نکال کر تمہیں دے دوں؟"

دھرم کرم شاہ کوتاہ قامت تھے۔ طویل القامت بننے کے لئے اپنا پیدائشی نام چھوڑ دیا۔ اور ایک طویل نام رکھ لیا۔ دھرم کرم شاہ!! پہلا الیکشن لڑا، جس میں ضمانت ضبط ہوئی، تو ورکروں نے اعتراض کیا کہ جلسوں میں آپ کے حق میں نعرہ لگاتے ہیں تو نام کی طوالت میں نعرے کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نام کو مختصر کرنے کے لئے۔ ڈی۔ کے شاہ بن گئے۔ بلکہ دوسرے الیکشن میں تو "ڈیشاہ" کے نعرے لگائے گئے (مگر ضمانت پھر بھی نہ بچ سکی)

تیسری مرتبہ طویل القامتی کا ایک منصوبہ بنایا۔ ڈرائننگ روم میں کمرہ بند کیے بیٹھے۔ سر پہ اونچے طرّے والی پگڑی باندھتے۔ اونچی ایڑی کا بوٹ پہنتے گھٹنوں سے کافی نیچے لمبا اور کھلا کوٹ زیب تن فرماتے۔ غرض طویل القامتی کے لئے پورا ڈیڑھ گھنٹہ کمرے میں صرف کرتے (ظاہر ہے کمرہ بند کر کے) اور پھر جب باہر نکلتے تو کسی فلم کے سائڈ ہیرو لگتے۔ مگر طویل قد والے سائڈ ہیرو کو تیسرے الیکشن میں تین سو چھپن ووٹ ملے میں راقم تبریکی کے لئے گیا تو بولے۔ "کم از کم یہ معلومات تو حاصل ہو گئیں کہ میری کانسٹی ٹیونسی میں تین سو چھپن آدمی ذہین ایماندار اور اعلیٰ نظریہ کے مالک ہیں۔ باقی دو ہزار جاہلِ مطلق ہیں۔"

چوتھی مرتبہ جب حادثتاً کامیاب ہوئے، تو اپنی جاہل مطلق ووٹروں کی بدولت۔ مجھ سے کہنے لگے " فکر صاحب! اگر اس ملک میں جاہل مطلق لوگوں کی اکثریت نہ ہو۔ تو دیش کا مستقبل کافی تاریک ہو جائے "

کامیابی کے بعد پانچ سو روپیہ اپنے ورکروں میں تقسیم کیئے۔ یہ روپے ایک کپڑا مل کے سیٹھ نے عطا کیئے۔ کیونکہ سیٹھ لوگ اسی طرح ممبرانِ اسمبلی کو خریدنے کا آغاز کرتے ہیں۔ شری ڈی۔ کے شاہ نے دس دس روپے ہر ایک ورکر کو پیش کیئے۔ مگر ایک ورکر کے کرنسی نوٹوں میں ایک روپے کا ایک نوٹ بھی میلا اور گلا ہوا تھا۔ ورکر نے کہا " ڈی شاہ جی! میرے ساتھ یہ سپیشل رعایت کیوں کی ہے "

بولے ۔" نعرے لگاتے وقت تم نے ایک جلسے میں نہایت دھیمی آواز میں نعرے لگائے تھے۔ دھیمی آواز۔ میلا نوٹ!"

دھرم کرم شاہ میں ایک خوبی تھی جو انہیں سے ڈی پی او کی واقعہ جاتی
اس میں غلطی عوام کی ہے مگر عوام کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سختی سے ڈٹ جاتے۔ ایک مرتبہ ناجائز دکانیں گرائی جا رہی تھیں تو اپنا ڈنڈا لے کر جائے واردات پر جا پہنچے۔ پولیس کے تھانیدار کے رخسار پر زبردست طمانچہ جڑ دیا۔ سرکاری کاروائی میں مداخلت کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ جائے واردات دوسرے ایم۔ ایل۔ اے کی کانسٹی ٹیونسی میں تھی۔

کرپشن کے سخت دشمن تھے کولڈ ڈرنک والی ایک کمپنی نے انہیں آفر دی کہ ایک وزیر سے سفارش کروا دیجئے کہ ہمارے کولڈ ڈرنک کے خلاف کوئی

الیکشن نہ لیا جائے، تو کمپنی آپ کی خدمت میں پانچ سو روپیہ نذر کردے گی۔

بڑی کڑا کے دار فحش گالیاں دینے کے بعد انہیں کہا یہ مجھے لومڑی سمجھا ہے کیا؟ میں شیر ببر ہوں شیر ببر! خبردار اگر کبھی دوبارہ میرے پاس آئے، تو انڈیاں بھجوا دوں گا۔ کمپنی کرپشن کی برکت سے لکھوپتی کی بجائے کروڑپتی بن گئی۔ مگر وہ انہیں انڈیاں تو کجا۔ ڈسٹرک جیل بھی نہ بھجوا سکے۔ نہ کرپشن روک سکے، نہ اپنی کرپشن بند کروانے کی خواہش روک سکے۔ گویا اپنے اصول کے بڑے پابند تھے۔

نتیجہ تحت بالخیر یوں ہوا کہ اپنے سخت گیرانہ لہجہ اور عمل سے نہ عوام میں مقبول رہے نہ خواص میں حتیٰ کہ کیرا مل کے اس سیٹھ نے بھی وقت ضرورت مفت کا ریتہ دینا بند کردی۔ تو دھرم کرم شاہ کچھ مایوس ہو گئے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اگرچہ بعض لوگوں کا (جو دوست سے دشمن بن گئے تھے) خیال تھا کہ ان کے خلاف جو الیکشن پٹیشن دائر تھی۔ وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی ہونے والا تھا۔ لہٰذا کنارہ کشی تو یوں بھی کر دیئے جاتے۔

کنارہ کشی کے بعد اُن کی بیوی نے (جو ان پڑھ تھی) جو استری سدھار سبھا کی پریذیڈنٹ بن گئی تھی۔ اور بطور پریذیڈنٹ بڑی بڑی ایم۔ اے پاس عورتوں تک سے ناک چڑھا کر بات کرتی تھی۔ اب پھر پہلے کی طرح ان پڑھ بن گئی اور ہر عورت کو بہن جی، ماتا جی کہنے لگی۔

دھرم کرم شاہ نے سیاست پر تین حرف بھیج دیئے تو ایک ٹرک کے مالک کے ساتھ پچاس فیصد منافع پر ساجھے داری کرلی۔ ٹرک کا اصلی مالک

بلیک مارکیٹیا تھا۔ لہٰذا اس جرم میں پکڑا گیا۔ تو ٹرک سمیت پکڑا گیا۔ دھم کرم شاہ نے ملک کی ابتری اور غلاظت کی ساری ذمہ داری ملک کے ٹرانسپورٹ سسٹم پر ڈال دی۔ تھوڑا بہت زر و مال جو سیاسی کرپشن کے دوران کمایا تھا۔ ٹرک اُسے یوں کھا گیا۔ جیسے اُس نے ٹرک نہیں خریدا تھا۔ ہاتھی پالا۔

نہ تین اور بقا پر اہم مگر باطن ذیل کا روبار شروع کئے جو انہیں صرف غم دے گئے۔ اور کچھ نہیں دے گئے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ غم دوراں کا واحد علاج مے گساری ہے۔ چنانچہ شراب نوشی شروع کر دی، مگر شراب مہنگی تھی، غم سستا تھا۔ لہٰذا مے نوشی سے توبہ کر لی۔ گذشتہ دنوں میں ایک بس میں سفر کرتے ہوئے نظر آ گئے۔ (ریاستدہ جو کار پر سفر کیا کرتے تھے) کنڈکٹر کو دھمکا رہے تھے " میرے باقی پیسے واپس کرو، ورنہ جانتے ہو میں کون ہوں، دھم کرم شاہ! جیل میں بند کروا دوں گا۔"

کنڈکٹر بولا " ارے بڑے بڑے شاہ دیکھے ہیں۔ شاہ ایران کا حشر معلوم ہے؟"

وہ بولے " میں تو شاہ ایران کا بھی بادشاہ ہوں۔ لگاؤں گا ایک تھپڑ" اور یہ کہتے کہتے اُس نے واقعی کنڈکٹر کے چہرے پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ کنڈکٹر غصے میں آیا، گھنٹی بجائی۔ بس رُک گئی۔ اور کنڈکٹر نے اُسے زبردستی دھکا دے کر بس کے نیچے یوں گرا دیا۔ جیسے وہ کنڈکٹر نہ ہو۔ ایران کا خمینی ہو۔

تین دنوں کی ڈائری

سوم وار —

کل رات سونے سے پہلے پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح بیدار ہوتے ہی مرن برت شروع کر دوں گا۔ فیصلے کو مزید پختہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ کسی ایسی چیز کی قسم کھاؤں جو مجھے سب سے پیاری ہو۔ چنانچہ اپنی ہی قسم کھائی۔

مرن برت کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ بیوی اگرچہ پریم کماریوں میں شامل ہونے کا اعلان کر کے چلی گئی تھی تو میرے لیے یہ بہت معمولی وجہ تھی۔ کئی بڑے سیاستدان جب مرن برت رکھتے ہیں تو ان کی وجہیں بھی معمولی ہوتی ہیں۔ کچھ دن کے بعد مرن برت ختم کر دیتے ہیں۔ ختم کرنے کی وجہ بھی معقول نہیں ہوتی۔

مگر صبح آنکھ کھلی تو کیا دیکھا۔ بیوی سرہانے کھڑی بیڈ ٹی ہاتھ میں لیے ہوئے ہے مرن برت کی قبر پر روشن کیے جانے والا چراغ — بیڈ ٹی کا ایک کپ!

میں نے پوچھا "سکونِ قلب حاصل کر آئیں ؟"

"سکونِ قلب کو آشرم میں ہی چھوڑ کر بھاگ آئی ۔"

"کیوں ؟"

"پریم کماریوں کے آشرم میں چند اوباش اور آوارہ لونڈے ممبر بن گئے ہیں ۔ آپ اٹھیئے اور چائے پی لیجئے ۔"

مرن برت کا پختہ فیصلہ ترک کر دیا ۔ میرے ہر پختہ فیصلے کی تاریخ ، ناپختگی کی تاریخ ہے ۔ یہ سوچ کر سکونِ قلب حاصل ہوا کہ میں ایک بیوقوف بیوی کا خاوند ہوں ۔ لیکن مرن برت کا فیصلہ کر کے میں نے بھی بیوقوفی کی تھی ۔

چنانچہ ہم دونوں بیوقوفوں کا پورا دن بیوقوفانہ حرکتوں میں گزرا ۔ آلو ، بینگن کے ریٹ پر رونا دھونا ، بچوں کے گستاخانہ اخلاق کی اصلاح کی تجویزوں پر غور (جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ پاس کی گئی تھیں اور فیل ہو گئی تھیں ۔)

رات کو سوتے وقت دونوں نے معاہدہ کیا کہ آئندہ نہ میں مرن برت رکھوں گا نہ وہ پریم کماری آشرم کی طرف بھاگے گی ۔

منگل وار ـــــ

آج دن بھر معاشرے کو راہِ راست پر لانے میں گزر گیا ۔ ہمارے محلے کے ایک کرائے دار بشن داس اور مالک مکان کشن داس میں معرکہ آرائی ہو گئی ۔ پہلے گالی گلوچ ، پھر ہاتھا پائی ، پھر لوٹ مار اور جب دو تین شرفا کو جائے واردات پر بُلایا گیا تو لُوٹ مار میں بشن داس کے گھر کا سارا سامان کشن داس

کے گھر اور کشن داس کے گھر کا سارا سامان بشن داس کے گھر پہنچ چکا تھا۔

" دونوں حضرت ایک دوسرے کے گھر کا سامان واپس کردیں " شرفا کے وفد نے فرمان جاری کیا۔

فریقین چونکہ مسلسل جدوجہد اور لوٹ مار کے بعد بری طرح تھک تھکا چکے تھے اس لئے سامان واپس کرنے کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کردیا۔ سر تسلیم خم کرنے میں نقاہت زیادہ تھی۔ چنانچہ ہم تینوں شرفا دن بھر بشن داس اور کشن داس کے گھروں کی ایک ایک چیز کی الگ الگ فہرست تیار کرنے میں مصروف رہے۔ اور یوں معاشرے کے سدھار میں شام کے پانچ بج گئے۔ تینوں شرفار چونکہ ریٹائرڈ انسان تھے۔ وقت کاٹنا ان کی پرابلم تھی۔ چنانچہ تینوں کا وقت خوش اسلوبی سے کٹا۔

جب فہرستیں تیار ہو گئیں تو معلوم ہوا کہ دونوں اشیاء برابر، برابر اور ایک جیسی تھیں۔ البتہ کشن داس کی ایک امپورٹڈ گھڑی زیادہ تھی۔

مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ معرکہ آرائی کی بنیاد یہی امپورٹڈ گھڑی تھی۔ کشن داس کا بیان تھا کہ یہ گھڑی مجھے جدہ کے ایک دوست نے بطور تحفہ عنایت کی تھی مگر بشن داس کے بڑے بیٹے نے چرالی تھی۔ اور بشن داس کا بیان تھا کہ یہ گھڑی میں نے ایک ہپّی سے خریدی تھی اور اس کے بدلے میں اسے چرس مہیا کی تھی۔

میری تجویز پر شرفا کے وفد نے صاد کیا کہ ہر امپورٹیڈ چیز چونکہ ہمارے معاشرے کو برباد کر رہی ہے لہٰذا...... لہٰذا وہ گھڑی قریب کے ایک اندھے

کنویں میں پھینک دی جائے۔ نہ رہے گا امپورٹڈ بانس اور نہ بجے گی ہمارے معاشرے کی امپورٹڈ بانسری۔

جہیز کی بدولت مرے دادا

پارہ دار ــــــ

آج پورا دن خوش ذائقی میں گزرا۔ ہنسنے کو جی چاہا، بے وجہ ہنس دیئے۔ بے وجہ رونے کو جی چاہا، رو دیئے۔ البتہ شام کے ایک واقعہ نے کنفیوز کر دیا کہ محلے کی ایک نیم نوجوان عورت جل کر خاکستر ہو گئی۔ جلنے سے پہلے وہ ایک چٹ لکھ کر چھوڑ گئی۔ جس پر تحریر تھا "میری ساس اور سسر نے مجھ پر مٹی کا تیل چھڑکا اور مجھے جلا دیا"

اور یہ چٹ پولیس انسپکٹر کے قبضے میں تھی۔ لیکن ایسی موتیں چونکہ عام ہونے لگی تھیں۔ اس لئے میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ جو چیز عام ہو جائے چاہے آم ہوں یا خربوزے یا کرپشن۔ کوئی شہری بھی ان پر خاص توجہ نہیں دیتا۔

مگر رات کو مرحومہ کے ساس سسر میرے پاس آئے بولے "اجی، پولیس والے ہماری دن رات کی نیند حرام کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔ تم پر کیس بنائیں گے۔ کیونکہ مرحومہ کی وہ چٹ ہمارے پاس ہے جس میں اس نے آپ پر الزام لگایا ہے کہ ساس سسر نے مجھے مٹی کے تیل سے جلایا"

میں نے کہا۔ "بھئی! مرحومہ کی چٹ موجود ہے تو کیس ضرور بنایا جائے گا۔"

آس کا سسر بولا، "مگر جی! یہ چٹ مرحومہ نے نہیں لکھی"

"تم کیسے جانتے ہو کہ اس نے نہیں لکھی۔"

"کیونکہ جی! وہ ان پڑھ تھی۔ میرا بیٹا بھی ان پڑھ ہے جی! جبھی تو دونوں ان پڑھوں کا۔ بیاہ ہو گیا تھا۔ آپ یہ بات تھانیدار کو بتا دیجئے۔"

میں نے وعدہ کیا ہے کہ اسے بتا دوں گا کہ دونوں کا سوشل سٹیٹس برابر تھا۔ یعنی دونوں ان پڑھ تھے اور یہ چٹ اپنے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کے پاس بھیج دیجئے۔ جو یہ رپورٹ دے کہ یہ چٹ کسی پڑھے لکھے آدمی نے لکھی ہے؟

ماچس کا بارٹر سسٹم

آپ (اپنے لئے نہیں) اپنے بال بچوں کے لئے (بال بچوں میں طوعاً و کرہاً بیوی کو بھی شامل کر لیجئے) ایک فروٹ شاپ سے انگور خریدیئے۔ اور اس کے بدلے میں ماچس کا ایک پیکٹ دوکاندار کو پیش کر دیجئے کہ انگور کے بدلے میں یہ ماچس قبول فرمائیے۔

مگر اس سے پہلے کہ فروٹ شاپ والا آپ پر ایسی قسم کی گالیاں عرض کر دے۔ کیونکہ پھل بیچتے بیچتے اس نے ایک کار خرید لی ہے اور کار والے کو گالیاں دینے کا کانسٹی ٹیوشنل حق ملا ہوا ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ آپ انگور خریدنے کا خیال ہی ترک کر دیں۔ کم از کم اس جنم میں تو ترک ہی کر دیں۔ میرا مطلب ہے وزیر خزانہ کے اس بیان کو گندی نالی میں پھینک دیں جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ سال گذشتہ

کے مقابلے موجودہ سال میں مہنگائی کم ہوگئی ہے۔ وزیر خزانہ کوئی بھی ہو اس
پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے (خود وزیر کو اپنے بیان پر اعتبار نہیں ہوتا ہے)
ہاں، ماچس کے بدلے میں آپ کو انگور نہیں مل سکتے کیونکہ اس کا رواج
کبھی صرف شرفائ میں تھا اور خدا نے شرفائ کی پیدائش بند کردی ہے جس طرح
شعر و ادب میں کئی لفظ متروک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے شرفاء بھی متروک
ہوگئے ہیں۔ جب وزیروں کے بیٹے بیٹیاں تک روزی روشن میں ڈاکے ڈال
رہے ہیں، وہاں شرفائ کو پیدا کرنا بیوقوفی ہے۔ اور خدا بیوقوف نہیں ہے۔
میں شرفائ کا زمانہ اس زمانے کو کہتا ہوں جب اشیاء کے بارٹر سسٹم
کا رواج تھا۔ ماچس کے بدلے میں گالیاں نہیں، انگور ہی ملتے تھے۔ جوتے
کے بدلے میں اناج اور کپڑے کے بدلے میں مٹھائی۔ اور اس سسٹم کو بُرا
نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انسان بہت تہذیب یافتہ تھے جبکہ آج کل کے زمانے میں
صرف اسے تہذیب یافتہ سمجھا جاتا ہے جو ڈسکو ڈانس کر کے ناچ گا سکے۔
بارٹر سسٹم کی تہذیب اس دن قبر میں اتاری گئی جس دن کسی نے
پیسہ نام کی چیز ایجاد کر ڈالی۔ اور ماچس اور انگور کو ایک دوسرے سے
الگ کر دیا۔ بلکہ انسان اور انسان کی محبت بھرے رشتے کو بھی چیر دیا چنانچہ
جب سے پیسہ پیدا ہوا ہے۔ انسان کا انسان پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے صرف
پیسہ پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب کار پر سوار میرے
پاس سے گزرے۔ کار روک لی اور پوچھا کہ "صاحب کیا آپ میرے دوست
ہیں۔۔۔؟"

میں نے پہچانا نہیں (میری عینک کا نمبر کافی بڑھ گیا تھا) لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں بُرا نہ مان جائے. کہہ دیا ۔" جی ہاں، جی ہاں، آپ میرے دوست ہیں ۔"

وہ بولا ۔" یاد کیجئے ۔ آپ کا ایک دوست سریش نام کا تھا ۔ میں وہی سریش ہوں ۔"

سریش نام کے میرے کئی دوست ہیں ۔ اس لئے میں نے سوچا ضرور اُن سریشوں میں سے کوئی ایک سریش ہو گا چنانچہ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا اور کہا ۔" فرمائیے، میرے لائق کوئی خدمت ہے ؟"

وہ بولا ۔" آپ مجھے سر خم کر کے سلام کیجئے ۔"

" کیوں ؟"

" دیکھتے نہیں، اب میں ایک کار کا مالک ہوں . لہٰذا اب میں آپ کا دوست صرف اسی صورت میں رہ سکتا ہوں کہ آپ جب بھی ملیں، سر تسلیم خم کر کے مجھے سلام کریں ورنہ دوستی ختم ۔!"

چنانچہ میں نے سر تسلیم خم کر دیا اور سلام کیا ۔ مگر اس دوست کو نہیں بلکہ چمکیلی کار کو جو اس نے بینک کے روپے سے خریدی تھی ۔ اب میری دوستی کار سے ہو گئی انسان سے نہیں

لیکن یوں لگتا ہے . پیسے کی تہذیب ایسی منزل پر آگئی ہے جیسے روما کی تہذیب ختم ہونے لگی تھی ۔ یعنی جب جسم سے رُوح نکلی جا رہی تھی ۔

گزشتہ دنوں ہریانہ کے ایک بس ٹرمینل پر بکنگ کلرک نے ماچسوں کے کئی پیکٹ اپنے پاس رکھ لئے۔ کیونکہ ریزگاری کی قلت ہوگئی تھی تو مسافر کے بیس یا چالیس پیسے واپس ادا کرنے ہوتے تو وہ پیسوں کی بجائے کہہ دیتا۔
"یہ لو ایک ماچس، دو ماچس"

اور کہتے ہیں۔ مسافروں نے بڑی فراخ دلی سے وہ ماچسیں قبول کرلیں، کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اسی سے اشارہ ملتا ہے کہ لوگ پیسے سے انتہائی تنگ آچکے ہیں اور ماچس کو پیسے سے زیادہ بہتر نعم البدل سمجھنے لگے ہیں۔

جب کہ مثل مشہور ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس بکنگ کلرک نے بارٹر سسٹم کی شروعات کردی ہے۔ اور شرفاء کی تہذیب کا زمانہ پھر لوٹ کر آنے والا ہے۔ اور اگر اس شروعات کو ہریانہ میں پسند کیا گیا ہے تو آہستہ آہستہ اعلیٰ انسانی قدروں کی یہ لہر ملک بھر میں پھیل جائے گی۔ جس آدمی کے پاس بالفرض ایک لاکھ روپے ہوں گے وہ یا تو خودکشی کرلے گا کیونکہ اسے ایک لاکھ روپے کے عوض ایک سگریٹ تک نہیں ملے گا۔ سگریٹ فروش کہے گا۔ "قبلہ! یہ روپے اب میرے لئے ایک کوڑی کے نہیں رہے۔ چنانچہ گیٹ آؤٹ!"
وہ کہے گا۔ "مگر بھائی میں نے سگریٹ نہ پیا تو مجھے بیچینی ہو جائے گی بھگوان کے لئے ایک سگریٹ عنایت کردو۔"
"سگریٹ پینا ہے تو پھر یوں کیجئے، اپنا ایک رومال دے دیجئے۔"

"رومال کیا کریں گے آپ؟"

"اپنے کتھے سے بھرے ہوئے ہاتھ صاف کیا کروں گا۔"

اور کرپشن جو ہمارا نیشنل کیریکٹر بن گئی ہے۔ ایک زہر ہے جو ہمارے ہر سوچ اور ہر حرکت میں شہد بن کر گھلتی جا رہی ہے۔ نئے بارٹر سسٹم سے اس کی گت۔ بلکہ دُرگت بن جائے گی۔ آپ دفتر کے کسی افسر سے ملنے گئے ہیں چپراسی کہتا ہے۔

"صاحب! ہمارا چائے پانی۔ اگر چائے پانی نہیں دیں گے تو صاحب باتھ روم میں ہی رہیں گے۔ اور پرسوں سے پہلے نہیں نکلیں گے۔"

آپ چپراسی سے پوچھیں گے۔ "کتنے کپ چائے؟"

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہے گا۔ "آدھا کپ ایک نکہ صبح سے رشوت کی چائے پیتے پیتے پیٹ میں اپھارہ شروع ہو گیا ہے۔ سالا جب سے پیسے کا رواج ختم ہوا ہے، اپھارہ میں مبتلا کر گیا ہے۔"

آپ پہ شرافتِ نفس غالب آ جائے گی۔ "تو پھر ایک سگریٹ ہی پی لیجئے۔"

"نہیں کھانسی ہے مجھے۔"

"تو پھر دو چار ماچسیں ہی قبول کر لیجئے۔"

"چلئے پھر ماچسوں ہی کی عنایت کر دیجئے۔ شام کو ان کے بدلے بچوں کے لئے ایک آدھ کھلونا ہی لے جاؤں گا۔"

تقریب بے تریبی کی

یہ تقریر میں نے اُس وقت کی جب جناب ڈی۔ پی آہوجہ کی تصنیف "منقار زیرِ پر" کی رونمائی کی تقریب منائی جا رہی تھی۔

دوستو! جن میں صاحب صدر چیف گیسٹ آنریبل وزیر زراعت بھی شامل ہیں۔! جناب ڈی پی آہوجہ سے میرے تعلقات بہت قریبی ہیں۔ اتنے قریبی کہ ہم ایک دوسرے سے سگریٹ بھی مانگ کر نوش فرمایا کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا میں جو آدمی ایک دوسرے سے سگریٹ بھی مانگ کر نہیں پیتے وہ ایک دوسرے کے رشتہ دار تو بن سکتے ہیں۔ دوست نہیں بن سکتے۔

گزشتہ دنوں ڈاکیہ مجھے اس تقریب کا دعوت نامہ دے گیا۔ وہ ڈاکیہ مجھے غیر ضروری خط ضرور دے جاتا ہے۔ باقی خط یا تو دوسروں کے گھر پہنچ

جاتا ہے۔ اور یا کسی اندھے کنوئیں کی نذر کر جاتا ہے۔ میں اُسے کہا کرتا ہوں۔ "جگن ناتھ! اس نظامِ حکومت میں اپنی شینی کا یہ عالم ذرا اور تیز ہو گیا تو۔ تم انقلاب ضرور لے آؤ گے۔ لہٰذا انقلاب زندہ باد!

ڈی۔ پی۔ آہوجہ آئی۔ اے۔ ایس آفیسر ہیں۔ اس لئے اب سگریٹ کی مانگ تانگ کی سطح سے بہت اونچے اٹھ چکے ہیں۔ اونچے اس لئے اُٹھ گئے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ نیچے جا چکے ہیں۔ آج کل خود سگریٹ نہیں پیتے بلکہ ملاقاتیوں کو امپورٹڈ سگریٹ کچھ اس اسلوب سے پیش کرتے ہیں۔ جیسے کوئی شعر عرض کر رہے ہوں۔ ادب نوازی کی یہ انتہا ہے کہ اُن کے عہدِ حکومت میں سگریٹ کو شعر کا مرتبہ نصیب ہوا؟

ہاں، آہوجہ صاحب آئی۔ اے۔ ایس آفیسر ہیں۔ ان کے والد صاحب آئی۔ اے۔ ایس نہیں تھے۔ ایک پرائمری سکول میں ٹیچر تھے۔ اُن کے دادا محترم بھی آئی۔ اے۔ ایس نہیں تھے۔ وہ کیا تھے؟ اس کے متعلق آہوجہ صاحب اور اُن کے والد کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ البتہ اُن کے پردادا صاحب کے بارے میں اس امر پر سارا خاندان متفق الرائے ہے۔ کہ جب پردادا صاحب کا کاروانِ حیات منزل پر پہنچا، تو مغلیہ سلطنت کا بھی انجام ہو گیا۔ گویا اُن کے پردادا ہی تھے مغلیہ سلطنت تھے۔ بعض تنگ نظر کینہ پرور۔ اشخاص کا بیان ہے کہ ان کے پردادا آخری مغل بادشاہ کے درباری تھے۔ مگر اس میں خفت کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ بادشاہوں کو اپنے دربار کے لئے ہمیشہ درباریوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ورنہ دربار اور سلطنت دونوں سونے پڑ جاتے ہیں۔

سامعینِ کرام! آپ شاید یہ اعتراض کریں گے کہ میں بے پر کی تقریر کر رہا ہوں۔ لیکن یہ میرا نہیں اس دور کا المیہ ہے کہ لوگ سنجیدہ تقریروں پر اونگھنے لگتے ہیں۔ مگر بے پر کی باتوں پر چہچہا اٹھتے ہیں۔ میں تو بے پر کا یہ پس منظر اس لئے بیان کر رہا تھا تاکہ آپ کی معلومات جو آپ کے چہرے سے دیکھنے پر مجھے ناقص معلوم ہوتی ہیں، اُن میں کچھ اضافہ ہو۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جناب آہوجہ کے خاندان میں جب نہ کوئی شعریت تھی اور نہ حکومت! پھر بھی آج آپ نے اُن کی کتاب "منقارِ زیرِ پر" کے جشنِ رونمائی پر پورے ہال کو یوں بھر دیا ہے۔ جیسے ..... جیسے ..... جیسے مثلاً آہوجہ صاحب اگر ابھی مائیک پر آکر کہیں — "میری کتاب کا نام ہے منقارِ زیرِ پر۔"

تو آپ تالیاں بجا کر داد دیں گے۔ "واہ، واہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ!"

اور آہوجہ صاحب دوسرا فقرہ کہیں "میں آج صبح غسل فرما کر آیا ہوں۔"

آپ کہیں گے۔ "مکرر! مکرر!"

گویا آپ گنبد کی آواز بن گئے ہیں۔ اور فقط اس لئے بن گئے ہیں، کہ وہ آئی۔اے۔ایس آفیسر ہیں۔ میں ایک ایسے شاعر کو جانتا ہوں جو رات رات کو ایک بھٹیارن کے تندور کے عقب میں بیٹھ کر ناجائز سستی شراب کے گھونٹ پیتا ہے۔ اور وہیں جب دردِ زہ قسم کے کرب سے اُگتے ہوئے اپنے شعر سناتا ہے تو تندور کی ٹھنڈی راکھ میں حرارت اور خوشبو طلوع ہو جاتی ہے۔ لیکن جناب زیرِ پر اعت کبھی اس تندور کے اوگھانش کے لئے چیف گیسٹ بن کر نہیں جاتے۔ تندور پر تو صرف بھٹیارن کا دوست

لیتے جاتے ہیں اور پھر ووٹوں کی اکثریت سے جب وزیر بن جاتے ہیں۔
تو آئی۔ اے۔ ایس افسر کی کتاب کی رونمائی کرنے لگتے ہیں۔

مشہور فلسفی ارسطو نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ریاست کے بادشاہ کو ادب، مصوری اور موسیقی کی بھی سرپرستی کرنا چاہیے۔ نذیر صاحب کی سرپرستی کے پیچھے شاید ارسطو کی یہی فلاسفی ہو۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، کہ وزیر صاحب نے ارسطو کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں لیکن مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ انھوں نے ارسطو کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ارسطو کا نام تو "منقار زیر پر" کے شاعر آہوجہ صاحب نے بھی ضرور سنا ہوگا۔ یہ ارسطو کی فلاسفی کی ٹریجڈی ہے یا آہوجہ صاحب کی کہ وہ بیک وقت ریاست کا ایک ستون بھی ہیں اور شاعر بھی۔ بہتر تو یہ تھا کہ وہ صرف جمہوری ریاست کے ستون ہوتے، شاعر نہ ہوتے۔ ریاستی ستونوں کا فرض صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ ادب اور آرٹ کو فروغ دینے کے منصوبے بنائیں۔ تاکہ ادب اور آرٹ سے ریاست کے بادشاہ کا اقتدار مستحکم رہے۔ لیکن آہوجہ صاحب نے غضب یہ کیا۔ کہ انہوں نے ادب اور آرٹ کی مناپلی بھی خود لے لی۔ اور حکومت کا ستون بننے کی مناپلی بھی۔ اگر اسی طرح کل کوئی بہت بڑا اپر انس میں بھی زنانہ نویسی شروع کر دے۔ تو آپ اُن سے یہ مت کہیے، کہ آپ تجارت کے ساتھ ساتھ افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ غضبناک ہو جائے گا۔ اور دھمکی دے گا۔ کہ میں آپ کو نظر بندی ایکٹ کے تحت قید کرا دوں گا کیونکہ میں ریاست کی بہبودی اور استحکام کے لئے افسانہ

نویسی کرتا ہوں ؟

آپ یہ بھی پوچھیے کہ "آپ مجھے اس ایکٹ کے تحت قید کروا سکتے ہیں ؟ تو وہ جھٹ جواب دے گا " کیونکہ میرا بھائی آئی اے ایس آفیسر ہے " اگر میری یہ اطلاع غلط نہیں تو آبوجہ صاحب کو اعتراف کرنا چاہیئے کہ ان کے ماموں جان دو کلاتھ ملوں کے مالک ہیں - اور ایک بہت عظیم مندر کی منیجنگ کمیٹی کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہیں میرا مطلب یہ ہے حضرات ! کہ ارسطو کی فلاسفی ان سبھی حضرات نے پڑھ رکھی ہے وزیر زراعت نے بھی "آئی اے ایس آفیسر نے بھی اور کلاتھ ملز کے سیٹھ نے بھی - اور یہ سبھی ریاست کو مستحکم رکھنے والے ستون ہیں - اس کے علاوہ آبوجہ صاحب کی شاعری پر داد دینے والے پچاس ساٹھ افراد ایسے بھی ہیں جو صرف اس لئے اُن کی شاعری کے مدّاح ہیں تاکہ اس داد کے بدلے میں کچھ اپنی ذات کے لئے پا سکیں - کچھ مرغے ، کچھ دھمکیاں ، کچھ مکان کی الاٹمنٹ ، کوئی ٹھیکہ ، کچھ سرکاری خزانے سے امداد - کیونکہ یہ سبھی عمل ، نظامِ جمہوریت کا تقاضا اور ضرورت بن گئے ہیں -

لیکن اگر میری ان بے سر پیر کی باتوں پر کچھ حضرات طیش میں آجائیں تو میں عرض کروں گا کہ آبوجہ صاحب نہایت قابلِ قدر شاعر ہیں " مثلاً ان کے یہ اشعار کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا کرے

زندگی اپنے ستونوں پہ کھڑی ہے دوستو
جتنے غلط سے بھی اعلیٰ ہیں ، ستونوں پہ کھڑی ہے دوستو

(یہ شعر سنتے ہی وزیر صاحب نے بے ساختہ داد کی تالی بجائی ، مگر میں اُن سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ اس کا دوسرا مصرع وزن سے خارج ہے - بالکل اُسی طرح جیسے آپ کی سیاست وزن سے خارج ہے ، مگر پھر بھی داد پاتی ہے)

ایک بچے نے کہا

میرا ایک ننھا سا پوتا ہے۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ بڑا ہو کر ادیب نہیں بنے گا۔ لیکن مجھے اس مشینی عہد میں کسی کے وعدے پر اعتبار نہیں رہا۔ چند دن ہوئے اس برخوردار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بڑی عمر کے کسی فرد کو مارے گا نہیں۔ لیکن کل شام اُس نے میری پیٹھ پر تین چار مکّے زور سے جما دیئے۔ میں نے کہا "برخوردار تم وعدہ شکن نکلے۔"

وہ معصومیت سے پوچھنے لگا "دادا! وعدہ کیا ہوتا ہے۔"

"وعدے دو طرح کے ہوتے ہیں بیٹا! ایک وہ جو شریف آدمی کرتے ہیں اور اُسے پورا کرتے ہیں اور دوسرا وہ جو لیڈر کرتے ہیں اور پورا نہیں کرتے۔ لہٰذا تم بڑے ہو کر لیڈر بنو گے کیونکہ تم نے وعدہ کرنے کے باوجود مجھے مکّے مار دیئے۔"

"دادا! لیڈر کون ہوتا ہے۔ کیا وہ مکّے مارتا ہے۔ اور جواب میں کوئی اُسے مکّے نہیں مارتا۔"

"لیڈر وہ ہوتا ہے بیٹا! جس کے دو روپ ہوتے ہیں۔ فرض کرو تم بھوکے ہو۔ تو وہ تم سے وعدہ کرے گا کہ میں تمہیں مکھن والا ٹوسٹ لا دوں گا۔ دوسرا روپ یہ ہے کہ وہ ٹوسٹ لاکر تمہیں نہیں دیتا۔ خود کھا جاتا ہے۔ کیا تم لیڈر بننا پسند کروگے۔"

"ایک شرط پر دادا! کہ جب میں ٹوسٹ کھا رہا ہوں۔ تو کوئی آکر مجھے مکّے نہ مارے — نہیں مارے گا نا کوئی مکّے؟"

"نہیں بیٹا! مکّے تو اُسے مارتے ہیں۔ کیونکہ اُس نے وعدہ توڑا لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، اگر وہ ممبر اسمبلی بن جائے تو پانچ سال تک اُسے کوئی مکّے نہیں مار سکتا۔"

"تو دادا! وہ پانچ سال تک کیا کرتا رہتا ہے؟ کیا ٹوسٹ کھاتا رہتا ہے؟"

"ہاں ہاں، نہ صرف ٹوسٹ بلکہ اور بھی کئی طرح کے عیش کرتا ہے۔ بڑے بڑے پیسے والے اور کرسیوں والے، یہاں تک کہ چور ڈاکو تک اُسے سلام کرنے آتے ہیں۔ بیش قیمت تحفے لاتے ہیں۔"

"پھر تو میں بھی ممبر اسمبلی بنوں گا۔ لیڈر نہیں بنوں گا۔"

"پگلے! ممبر اسمبلی اور لیڈر ایک دوسرے کا ترجمہ ہیں۔ نام دو ہیں، کام ایک ہے۔"

"مگر میں ممبر اسمبلی بنوں گا دادا! کھانے پینے کے علاوہ اور اس میں کیا فائدے

ہیں۔"

"ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے بیٹا! دل بدلی کر جاؤ۔ دوسری پارٹی والے تمہیں تین چار لاکھ روپے دے دیں گے۔ ایک دو لاکھ روپے زیادہ بھی دے دیں گے۔ بشرطیکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ میٹرک فیل نہیں ہے، بی۔اے پاس ہے۔ تھرڈ ڈویژن میں۔"

میرا پوتا بڑا بے چین ہو گیا۔ "پھر تو میں دل بدلی ضرور کروں گا۔ یہ دل بدلی کیا ہوتی ہے دادا! کیسے کی جاتی ہے۔"

"میں نے اُسے سمجھایا۔ دیکھو، تم میرے پوتے ہو نا؟ سچ سچ بولو پوتے ہو نا؟"

"بالکل ہوں، آپ میرے دادا! اور میں آپ کا پوتا۔"

"اچھا تو پھر ایک دن اچانک، کہ تمہیں کوئی آدمی ایک لاکھ روپے دے اور کہے، کہ اپنے دادا سے کہو کہ میں آپ کا پوتا نہیں ہوں، بلکہ اس کا پوتا ہوں جس نے مجھے ایک لاکھ روپے دیئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے دل بدلی کی۔ مجھ سے رشتہ توڑ دیا صرف چند روپوں کی خاطر۔"

میرا پوتا میری گردن میں اپنی باہیں ڈال کر بولا۔ "نہیں دادا نہیں۔ یہ تو جھوٹ ہو گا۔ آپ میرے دادا ہیں، کیا میں چند روپوں کی خاطر اپنے دادا کو بیچ دوں گا؟"

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "ہائے بیٹا! روپوں کی خاطر تو لوگ اپنا دھرم بیچ دیتے ہیں۔ روپے زیادہ ہوں تو خدا تک کو بیچ دیتے ہیں۔"

"خدا کسے کہتے ہیں دادا؟" میرے پوتے نے پوچھا۔ اُسے اپنی معصومیت

کو بلاک کر کے سماجی معلومات حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔
میں نے بتایا۔ "کل جو تم نے میٹھے میٹھے رسیلے انگور کھائے تھے۔
انہیں خدا نے ہی پیدا کیا تھا۔
" پھر تو خدا اس ممبر اسمبلی سے زیادہ اچھا ہے۔ کیا ممبر اسمبلی بھی انگور پیدا کر سکتا ہے۔"
" اُسے ضرورت بھی کیا ہے۔ ڈاکو اُسے خود انگور لا کر تحفے کے طور پر دے دیتے ہیں۔"
" کیوں دے دیتے ہیں۔؟"
" کیونکہ ممبر اسمبلی جھوٹی گواہی دیتا ہے کہ میں نے انکوائری کی ہے کہ یہ ڈاکو نہیں ہے۔ چنانچہ جھوٹی گواہی کی خوشی میں ڈاکو اُسے انگور دے جاتے ہیں۔"

میرے پوتے کو جیسے غصہ چڑھ گیا۔ "یہ تو بُری بات ہے دادا! میں ان ڈاکوؤں اور ممبر اسمبلی کو گولی مار دوں گا۔ آپ میرے لئے وہ چھوٹا سا قرمزی رنگ کا پستول لائے تھے نا؟ میں اس کو دبا کر گولی مار دوں گا۔ ترڑ ترڑ ترڑ ترڑ!"
" نہیں بیٹا! گولی مارنا بُری بات ہے! عوام گولی ماریں تو اُسے جمہوریت پسندی نہیں کہتے۔ گولی تو صرف پولیس مار سکتی ہے۔"
" لیکن کل آپ کہہ رہے تھے دادا! کہ پولیس نے ایک جگہ ٹیر گیس چھوڑی۔ گولی نہیں ماری۔ یہ ٹیر گیس کیا ہوتی ہے دادا! کیا یہ گولی نہیں ہوتی۔"
" نہیں بیٹا! گولی سے لوگ مر جاتے ہیں۔ ٹیر گیس سے لوگ مرتے نہیں بھاگ

جاتے ہیں ۔"

" مگر یہ ٹیئر گیس کیسی ہوتی ہے ۔"

" یہ ایک بڑا سا گولہ ہوتا ہے جس میں آنسولانے والی گیس بھری ہوتی ہے ۔ گولا چھوڑا ، گیس باہر نکلی ۔ دھوئیں کا طوفان پھیلا ۔ دھواں آنکھوں میں گھس گیا ۔ جس سے ڈر کر لوگ بھاگ جاتے ہیں ۔"

" تو مجھے بھی شاپنگ سینٹر سے ٹیئر گیس کا ایک گولہ چل کر لے دو ۔"

" تم کیا کرو گے ۔ ؟"

" میری کلاس میں دو بدمعاش لڑکے ہیں ۔ ہر ایک کو ڈراتے دھمکاتے ہیں ۔ میں وہ گولا ان دونوں پر چھوڑ دوں گا ۔ وہ بھاگ جائیں گے ۔ ہاہاہا ۔ ہاہا ۔ بڑا مزا آجائے گا ۔"

" اگر وہ بھاگ جائیں تو تمہیں اس سے کیا خوشی ہوگی ۔"

" دادا ! مجھے نہیں ساری کلاس کو خوشی ہوگی ۔ بلکہ سب سے زیادہ ہماری میڈم کو خوشی ہوگی ۔ وہ ان سے بڑی پریشان رہتی ہے ۔"

" تو میڈم سے کہہ دو ، وہ دونوں لڑکے اگر غنڈے بدمعاش ہیں ۔ تو انہیں اسکول سے نکال دے ۔"

" ہائے ہائے ! آپ بھی بس ادیب ہیں دادا ! میڈم انہیں نہیں نکال سکتی نا ؟ کیونکہ وہ بہت بڑی پونچی والوں کے بیٹے ہیں نا ، جنہوں نے انھیں داخل کرانے کے لئے ، سکول کو پچیس پچیس ہزار روپے دیئے ہیں ۔"

آخری نوٹ :۔ مجھے خطرہ ہے کہ میرا پوتا دعدہ وفا نہیں کر سکے گا ۔ اور بڑا ہو کر عوامی ادیب ہی بنے گا ۔

میں۔ کہ ایک بزدل ہوں!

میں نے اپنے آپ کو بزدل سمجھ کر کبھی خفت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ لغات فیروزی میں بزدل کے معنی شریف بھی لکھے ہیں۔ لغات فیروزی میں ایک لفظ کے مختلف معنی لکھے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتی۔

کسی جلسے میں سٹیج پر میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا جائے تو میں ڈر جاتا ہوں کہ کہیں یہ لوگ مجھے ایسی کسی اونچی جگہ پر تو نہیں لے جانا چاہتے جہاں سے وہ دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیں۔ ڈر اس بات کا بھی رہتا ہے کہ اونچی جگہ پر جا کر میں خود نیچے چھلانگ لگا دوں (دوسرے نمبر کا چانس زیادہ ہوتا ہے)

ایک مرتبہ ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر سے گفتگو ہوئی۔ کہنے لگے "آپ کی سیاسی بصیرت اور نظریاتی اعتماد اتنا بلند رہا ہے کہ ......؟"

میں نے بزدلی سے سر جھکا لیا اور جھکے جھکے ہی کہا "آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو پارٹی کی ریاستی کمیٹی کا ممبر بنا دیا جائے۔ پھر الیکشن میں پارٹی ٹکٹ دیا جائے۔ اس کے بعد آپ اسمبلی ممبر بن جائیں گے اور اس کے بعد......؟"

اور اس کے بعد قارئینِ کرام! میں نے پارٹی چھوڑ دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں اس کے بعد میں وزیر نہ بنا جاؤں۔ مجھے وزیر بننے سے رات کو چاندنی چاندنی دیکھنا زیادہ پرکشش لگتی ہے۔

سوچتا ہوں شاید اس لیئے پرکشش لگتی ہے کہ چاندنی بے ضرر ہوتی ہے اور دنیا کے ہر بزدل (شریف) انسان کی کمزوری بے ضرر چیزیں ہی ہیں۔ وزارت میں تو لاکھ جھنجھٹ ...... ایمانداری کے نام پر بے ایمانی کرو ایمانداری کا صرف نام ہی لو۔ تو لوگ سمجھتے ہیں، سالا مکاری کر رہا ہے بے ایمانی کیئے بغیر یہ چند دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

نجانے کیوں؟ میں اپنی قدر و منزلت سے بدکتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں کچھ میرے خدا کا فیض شامل ہو۔ (حالانکہ میں خدا کو ماننے سے اکثر کتراتا ہوں) جونہی کوئی میری طرف ایسی کرسی پیش کرتا ہے جو دوسری کرسیوں سے قدرے اونچی اور کوالٹی میں قدرے بہتر ہو تو میری حالت دگرگوں ہو جاتی ہے اور اس وقت تو کچھ زیادہ دگرگوں ہو جاتی ہے جب کوئی مجھے گردن سے پکڑ کر اس کرسی پر بٹھا دے اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہے "بولو انقلاب

زندہ باد! فکر تونسوی کی جے۔

قدر و منزلت پر فنیکٹ کرنے کے لئے منتظمین ہمیشہ مطالبہ کرتے ہیں کہ صاحب صدر صدارتی تقریر کریں اور بہ سلسلۂ تقریر میری زبان گونگی ہے۔ قلم گونگا نہیں ہے۔ لہٰذا اپنی قدر و منزلت کو قعرِ مذلت میں گرانے کے لئے میری زبان سے ایسے بے معنی اور بے ربط فقرے نکلتے ہیں جو نہ صرف تعداد میں کم ہوتے ہیں بلکہ مقدار میں بھی ہیچمدان ہوتے ہیں۔

میں قعرِ مذلت میں خود نہیں گرتا بلکہ خدا نے وہ صلاحیت ہی عطا نہیں فرمائی کہ میں کوئی سحر انگیز تقریر کر سکوں۔ شاید اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو یا خدا کو میری ذلالت پر مسرت ہوتی ہو۔ ہاں، خدا کے معاملے میں ہر چیز ممکن ہے چنانچہ اکثر احباب کو میں نے یہ کہتے سنا ہے "فکر تونسوی؟ اسے ہار پہناؤ گے، صدر بناؤ گے، تقریر کرواؤ گے۔ اپنے فنکشن کا بیڑہ غرق کراؤ گے۔"

ہاں اعزاز و اکرام سے بچنے کے لئے میں اکثر پیچھے ہٹ جاتا ہوں اندیوں کی فنکشنوں کے بیڑے پار کروائے ہیں (اگرچہ کئی فنکشنوں میں میرے بغیر بھی بیڑے غرق ہوئے ہیں۔)

میرے ایک دوست ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ میں نے ہر سال پچاس فیصد ایسے مریضوں کے آپریشن کئے ہیں جو زندہ سلامت ہیں۔ باقی پچاس فیصدی کچھ اتنے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں کہ مریض ابھی تک قبر سے نہیں لوٹے۔

اور میں انہیں مبارکباد دیتے ہوئے کہتا ہوں "ڈاکٹر صاحب!
آج کل کے زمانے میں ۵۰ فیصدی کمیشن تو بہت زیادہ ہے۔ ورنہ
میرے ایسا ڈرپوک اگر ڈاکٹری کا پیشہ اپنا لیتا ہے تو مریض کو اس ڈر سے ہاتھ
نہ لگاتا کہ کہیں آپریشن اور قبر میں فیصد ہی باقی نہ رہے۔"
مگر وہ کہتے ہیں "آپ کا قلم تو سماج کا نہایت کامیاب آپریشن
کر رہا ہے۔"

"ہاں، اسی لئے تو قوم قبرستان کی طرف بڑھ رہی ہے۔"
وہ میرے مداح ہیں۔ ہر وہ مریض جو کلینک میں داخل ہوتا ہے اس
سے میرا تعارف یوں کراتے ہیں۔ "یہ ملک کی ایک مشہور ہستی
سے ملئے۔ یہ ہیں جناب فکر تونسوی صاحب، قلم کے دھنی، صداقت
کے علمبردار۔ اگر یہ یورپ میں پیدا ہوتے تو....."
اور اس سے پہلے کہ ملاقاتی مجھ سے بغلگیر ہونے کے لیے ہاتھ بڑھائے
میرے منہ سے بے اختیار نکل جاتا "نہیں صاحب! ڈاکٹر صاحب تو مذاق
کر رہے ہیں۔ میرے نصیب میں فکر تونسوی ہونا کہاں لکھا ہے۔ میں تو
یہاں ایک لیرچی پر خریدنے بیچتا ہوں۔ میرا نام گردھاری ہے۔"
اور ملاقاتی کا بغل گیرانہ ہاتھ رک جاتا ہے اور میں اس اعزاز عالیہ
سے بچ جاتا ہوں۔

میں بلندی پر پہنچنے سے کیوں کتراتا ہوں جبکہ دل ہی دل میں تسلیم
کرتا ہوں کہ میں بلند ہوں۔ لیکن بلند رہنے کے باوجود جو ذمے داریاں ڈال

دی جاتی ہیں۔ انہیں غیر ذمہ دارانہ تکنیک سے تباہ کر دیتا ہوں۔ میں جان بوجھ کر تباہ نہیں کرتا۔ وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔ ایک ادبی رسالے کی ایڈیٹری کی، رسالہ بند ہو گیا۔ محلہ سُدھار کمیٹی کا پریزیڈنٹ بنا تو کمیٹی مالی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ گزشتہ سال ایک یتیم خانے کے انچارج کی آفر دی گئی تو بزدل انچارج نے کہا "سوچ لیجئے ملک میں یتیموں کی تعداد دگنی ہو جائے گی۔"

کہا گیا "تو ہونے دیجئے۔ ملک میں غریبی اور یتیمی یوں بھی تو برابر بڑھ رہی ہے۔"

آخری اطلاع: میرے انچارج بننے کے ایک سال بعد یتیم خانے میں صرف دو انچارج باقی رہ گئے ہیں۔ ایک میں اور دوسرا یتیم خانے کا بورڈ ــــ باقی یتیم، میری بزدلی یا شرافت النفس کی برکت سے اُن بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ کر بھاگ گئے جو اُن یتیموں سے بھیک منگواتے ہیں اور اپنے دام کھرے کرتے ہیں۔

بینک لُوٹنے والے

آج کل بینک لُوٹنے والے اور جہیز زدہ عورتیں جلانے کی وارداتیں سُنتا ہوں۔ تو مجھے لگتا ہے دونوں میں سخت کمپی ٹیشن ہو رہا ہے۔ کل میں ایک پوش کالونی میں سے گزرا تو اہلِ ذوق میں مندرجہ ذیل ڈائیلاگ ہو رہا تھا۔

"میں نے آج ایک مہلا کو مٹی کے تیل سے جلا دیا۔"

"بس ایک؟ میں نے تو آج دو بینک لوٹے۔"

"دو بینک؟ تو پھر میں کل تین مہلاؤں کو پھونکوں گا۔"

"تین مہلاؤں کو پھونکو گے تو میں چار بینکوں کا پتّہ صاف کر دوں گا۔ گرہ باندھ لو کہ تم مجھے پچھاڑ نہیں سکتے۔"

یہ ڈائیلاگ سُنے تو مجھے لگا۔ سچ مچ کمپی ٹیشن میں ڈاکٹر اقبال والی خودی

شامل ہو گئی ہے ۔ اور شاید آنے والے دنوں میں بینک لوٹنے والے، مہلائیں جلانے والوں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے ۔ بلکہ عین ممکن ہے مہلائیں جلانے والے، بینک لوٹنے والوں میں شامل ہو جائیں ۔ دونوں جگہوں پر مسئلہ پیسے کا ہے، مہلا جلاؤ یا بینک لوٹو، دونوں عوامل میں پیسہ، پردھان ہے ۔

●———

سماج بدل رہا ہے اس لئے مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی ۔ بینک سے پانچ سات لاکھ اگر کوئی لوٹ کر لے جائے تو اُسے لوٹ لے جانے دو ۔ ایک لیڈر سے اس سوال پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ تو وہ بڑے دھڑن کے ساتھ بولا " ہاں، ہاں لوٹ لے جانے دو ۔ آخر لوٹ کا روپیہ وہ کہاں لے جائے گا ؟ اسی ملک میں ہی رہے گا ۔ وسکی پیئے گا ۔ دھسکی کی دکان کو فائدہ ! مرغ مسلم کھائے گا، ہوٹل کو فائدہ، اور ننگے ڈانس دیکھے گا، ڈانسنگ گرل کا کاروبار چمکے گا ——— حتیٰ کہ ایک بینک، لوٹنے والے نے عالیشان، بھگوتی جاگرن پر پچاس ہزار روپے خرچ کر ڈالے، جاگرن پر دھوم دھڑکا کرنے والے آرٹسٹوں کو دگنا معاوضہ دے دیا گیا ۔ غرض صاحب لوٹ کا مال ہندوستان میں ہی رہا ۔ کئی ہندوستانیوں نے بانٹ بانٹ کر کھایا، تو اس لوٹ کو برائی کیوں کہا جائے ۔ سماج وادی کیوں نہ کہا جائے ؟

لیڈر کے اس سماج وادی شعور پر میں بے حد خوش ہوا ۔ اور خوشی

خوشی اُس سے پوچھ لیا ۔" قبلہ! یوں لگتا ہے، آپ نے بھی کوئی بینک لوٹا ہے ؟"

بولے ۔" صرف ایک بینک لوٹا ہے ۔"

" تو آپ کی پارٹی کے چیف منسٹر پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا ؟"

" پر سوں کہہ رہے تھے تمہیں ڈپٹی منسٹر بنا دوں گا ۔"

" ڈپٹی منسٹر کیوں ؟ منسٹر کیوں نہیں ۔"

" ابھی بینک چھوٹا تھا ۔"

اس لئے میں تو کہتا ہوں، بینک لوٹنا کوئی عیب نہیں ہے (اور یوں بھی اب کونسی چیز بے عیب رہی ہے) گزشتہ دنوں بینک کے ایک منیجر سے کسی شادی پر ملاقات ہوئی ۔ لڑکی والے آدرش وادی تھے ۔ اس لئے ایک مندر میں صرف پانچ افراد کی موجودگی میں نہایت سادہ انداز میں شادی کردی ۔ آخر میں صرف ایک لاکھ روپے کا چیک دے دیا ۔ تعریف کی تالیاں بجائی گئیں ۔ پتا نہ شادی پر یا چیک پر ۔

بہرکیف اس بینک منیجر سے گفتگو ہوئی ۔ میں نے پوچھا ۔" جناب ! پانچ چھ دن پہلے آپ کا بینک بھی تو لوٹا گیا تھا ۔؟"

بڑی بے نیازی سے بولے ۔" جی ہاں، بالکل لوٹا گیا تھا ۔"

" کیا آپ کو کوئی ذاتی تکلیف نہیں ہوئی ۔؟"

" بالکل نہیں، صرف ایک ہلکی پھلکی سی تکلیف ہوئی تھی ۔ خزانچی کہتا تھا

آٹھ لاکھ روپیہ لوٹا گیا۔ مگر میں کھاتہ دیکھ کر کہتا تھا۔ آٹھ لاکھ ایک روپیہ لوٹا گیا۔ بہر کیف دو چار منٹ کی ردو قدح کے بعد ہم میں ایک سمجھوتہ ہو گیا کہ ایک روپیہ والی کوئی کلاسیکل غلطی ہو گی۔ اس لئے ہم نے ایک روپیہ کو کھاتے میں ڈال دیا۔"

میں منیجر کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ بڑا ملنگ منیجر ہے۔ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے آٹھ لاکھ روپیہ نہیں لوٹا گیا۔ پھٹی ہوئی جیب سے دس پیسے کا سکہ گر گیا۔ جو سڑک پر پڑا ہو تو اسے کوئی بھکاری بھی نہیں اٹھاتا۔

میں نے پوچھا "لگتا ہے، بینک بڑی آسانی اور سادہ طریقے سے لوٹا گیا"

" بالکل سادہ جی! مثلاً جیسے یہ شادی سادہ طریقے سے ہو رہی ہے "

" مگر اس شادی میں تو ایک لاکھ روپے کا چیک شامل ہوا"

" تو کیا ہوا، ہمارے بینک کی لوٹ میں بھی تو آٹھ لاکھ روپیہ شامل تھا"

میری حیرانی اور دلچسپی اور بڑھ گئی۔ کوئی جھجک نہیں، کوئی درد، کوئی افسوس، کوئی خدشہ ۔؟ کچھ بھی تو شامل نہیں۔ چنانچہ میں نے اس منیجر سے اس سادہ ڈکیتی کی تفصیلات پوچھیں۔ تو اور بھی لطف آیا۔ اس نے بڑے تفریحی لہجے میں بتایا۔

" دیکھئے جی! ہم نے بینک کے باہر بورڈ لکھ کر لٹکا دیا تھا۔ بینک لوٹنے والوں کو خوش آمدید۔" اگرچہ تمام ڈاکو ان پڑھ ہوتے ہیں۔ بورڈ پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن ہماری خوش نصیبی، کہ لٹیروں کے گروہ میں ایک وزیر کا بیٹا بھی شامل تھا۔ جس نے بورڈ پڑھ لیا۔ بالی دے دے! وزیر میٹرک فیل تھا، بیٹا گریجویٹ تھا۔ بینک کے گیٹ پر ہمارا مسلح پہرے دار بندوق سمیت کھڑا تھا۔ لٹیروں

کو دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنی بندوق سے انھیں سلام کیا۔ وہ پہرے دار اپنی جان بچانے میں بڑا ایکسپرٹ تھا۔

میں نے پوچھا "منیجر صاحب! لٹیروں کو دیکھ کر آپ کا اسٹاف بالکل نہیں گھبرایا؟"

" بالکل نہیں۔ سٹاف نے اپنے اپنے قلم رکھ دیئے یعنی "پین ڈاؤن سٹرائیک" کر دی۔ اور سگریٹ نکال کر کش کھینچنے اور ایک دوسرے کو لطیفے سنانے لگے۔ لیٹرے میرے کمرے میں گھس آئے یہ بولے ہم بینک لوٹنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "چشم ما روشن، دل ما شاد" اور کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے تشریف رکھیے، اور پھر میں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا۔ کہ تین کیا کولا کی بوتلیں لاؤ، غریب خانے پر وطن کے حکمراں آئے ہیں ۔۔۔ کیا کولا پینے کے بعد میں نے عرض کیا، اگر آپ اجازت دیں تو میں پولیس کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں۔ گھبرائیے نہیں ۔۔۔ پولیس جب یہاں آئے گی تو آپ مال و متاع لوٹ کر بخیریت واپس جا چکے ہوں گے لیٹرے بڑے خوش مزاج تھے۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ میں نے تھانے کا فون نمبر ملایا، تو وہ کانشی رام حلوائی کی دکان سے جا ملا۔ چنانچہ میں نے حلوائی سے ہی کہہ دیا کہ ہمارے ہاں بینک لوٹنے والے تشریف لائے ہیں۔ فرصت ہو تو قدم رنجہ فرمائیے۔

میں نے منیجر سے ہنس کر کہا "دیری گڈ! اس کے بعد کیا ہوا؟"

" اس کے بعد میں انہیں کیشئر کے کمرے میں لے گیا۔ کیشئر چائے پینے گیا ہوا تھا۔ چنانچہ لٹیروں نے آٹھ لاکھ روپے نکالے اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔ جاتے جاتے وہ پستول کی ایک گولی بھی چھت پر داغ گئے۔ کیونکہ میں نے انھیں کہا تھا۔ ظالمو! کچھ تو داغ جاؤ۔ تاکہ پولیس کو تفتیش کرنے کا چانس مہیا ہو سکے۔"

میں نے آخر میں کہا۔ "مگر افسوس ہے منیجر صاحب! آٹھ لاکھ روپے ضائع ہو گئے۔"

وہ بولا۔ "اجی افسوس کیسا! روپیہ کوئی ہمارا تھوڑا ہی تھا۔ پبلک کا تھا۔ قہ قہ قہ قہ......"

ہمارا پہناوا

خدا جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے، تو لباس پہنا کر نہیں بھیجتا۔ ننگا ہی بھیجتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میرے خیال میں یہ ہوگی کہ خدا کے پاس ٹیکسٹائل ملیں نہیں ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ خدا مہذب نہیں ہے۔ لباس تہذیب یافتگی کی علامت ہے۔ خدا یہ سوچتا ہے کہ انسان اگر تہذیب یافتہ بننا چاہے تو بن جائے، میری بلا سے اُسے مہذب بننے کی ضرورت پڑے گی تو لباس پہن لے گا۔ میرے لئے تو عریانی ہو یا پہناوا دونوں ایک سمان ہیں۔ خدا کے اس نقطۂ نظر کو غالب نے بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے تو کہا تھا۔

ع تنِ عریانی سے بہتر ہی نہیں کوئی لباس

یوں لگتا ہے کہ غالب اپنے خدا کے متعلق ہم سب سے زیادہ

معلومات رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لباس نے غالب کا بھی کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ شعر لکھ لینا آسان ہے، ننگا رہنا مشکل ہے۔ باتھ روم میں بھی غالب اگر ننگا ہوتا ہوگا تو مجبوراً ہوتا ہوگا۔ کیونکہ سوچتا ہوگا کہ لباس کے ساتھ غسل کیا۔ تو لباس بھیگ جائے گا۔ لباس کے آٹھ دس جوڑے ہوں تو آدمی ایک کی بجائے دوسرا لباس پہن لے۔ مگر غالب کے افلاس کا تو یہ عالم تھا کہ اُس نے ایک مرتبہ شاہِ ہندوستان کو ایک شاعرانہ مراسلہ بھیج کر درخواست کی تھی۔ کہ تبلہ

آپ کا بندہ پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

خیر، لباس پر میرے مضمون میں یہ غالب خواہ مخواہ بیچ میں در آیا۔ ورنہ میں تو اپنے عہدِ حاضر کے پیناوے کی بات کر رہا تھا۔ اندرا یا حکومت یا دونوں کی بندہ نوازی سے ہمارے ملک کا کوئی قومی لباس نہیں ہے۔ قوم ہو بلکہ قومی کیریکٹر ہو۔ تو کوئی قومی لباس ہو۔ اس لئے ہم نے آزاد ہونے کے بعد قومی غلامی اختیار کر لی۔ اور لباس کو ہی آزادی کا سمبل (علامت) بنا لیا۔ آپ کسی بھی اجتماع میں موجود ہوں۔ تو آپ کوٹ پتلون پہن کر کھڑے کسی آدمی سے پوچھیں "جناب آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟"

وہ جواب دے گا "آزاد ہندوستان سے"
اور پھر آپ سگریٹ پوش دوشیزہ سے پوچھئے۔
"محترمہ آپ کا ملک۔؟"

"آزاد ہندوستان۔"

ایک میلے کچیلے پھٹے پائجامے اور بنیان پوش سے معلوم کریں۔

"حضور کا وطن؟"

"آزاد ہندوستان۔"

غرض دھوتی کرتہ، شیروانی، گاندھی ٹوپی، نیلی پگڑی، نقاب، پاؤں کے گھٹنے کو چھو رہا ہوا لمبا کرتہ، آدھ ننگا، تین چوتھائی ننگا —— بلکہ فٹ پاتھ پر لیٹا ہوا پورا ننگا۔ جو یہ کہہ رہا ہوتا ہے۔

ع دیکھو جو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو

غرض ہمارے ملک میں لباس کی اتنی گوناگوں ورائیٹیاں ہیں کہ لگتا ہے کہ ہم اگر آزاد ہیں تو صرف لباس کے معاملے میں۔ ہم قوم نہیں ہیں، بلکہ بین الاقوامی ہیں۔ بلکہ پچھلے دنوں میں نے ایک افغان کو دیکھا جو افغانستان میں اشتراکی نظام قائم ہونے کے ڈر سے ہندوستان میں بھاگ آیا تھا۔ وہ یو۔ پی والوں کی طرح دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے پوچھا۔

"جناب! آپ کے ملک کا نام؟"

وہ بولا "آزاد ہندوستان ہے"

میں نے پوچھا "لیکن ابھی چند منٹ پہلے تو ایک آدمی سے فارسی میں گفتگو کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ کہ آپ افغانستان کے رفیوجی ہیں مگر لباس میں دھوتی کرتے کا استعمال کر رہے ہیں۔ تو کیوں؟"

وہ بولا "جیسا دیس، ویسا بھیس۔"

کل مجھے علم ہوا۔ کہ وہ چرس کی سمگلنگ کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا۔

جیسا دیس، ویسا بھیس اُسے چرس بیچنے کے دھندے کی آزادی تو دے سکتا ہے گرفتار ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ ترکی ٹوپی یا گاندھی ٹوپی پہن کر آپ کسی پر پستول کی گولیاں چلا دیں تو ہتھکڑی آپ کو ہی نہیں لگے گی، ٹوپیوں کو بھی لگ جائے گی۔ ٹوپی پہننے سے آدمی مہذب نہیں بن جاتا۔ مقدس لباس پہن کر مولانا خمینی نے ایران میں ہزاروں انقلابیوں کے سر اُڑا دیئے۔ تو وارثِ اُمت لباس مقدس نہیں کہے گی۔

تہذیب ظاہر میں نہیں ہوتی۔ باطن میں ہوتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملی جلی تہذیب میں یقین رکھتے ہیں۔ میں ایسے کئی حضرات کو جانتا ہوں جو نیچے تو کوٹ پتلون زیبِ تن کرتے ہیں مگر سر پر ہیٹ کی بجائے پگڑی باندھ لیتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر بزنس میں ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک سجن سے میں نے پوچھا۔ "جناب! لباس میں یہ دوغلا پن مجھے کچھ جچا نہیں۔ آپ فرنگی لباس پہنئے یا دیسی لباس۔"

وہ بولے۔ "اجی! ہم بزنس میں ہیں نا؟ کیا کریں، ایسا لباس نہ پہنیں تو دھندا کیسے چلے؟"

میں ایک شاعر صاحب کو جانتا ہوں۔ جن کے دل میں شروع ہی سے ایک پرانا کمپلیکس ہے کہ وہ ہمیشہ مہذب نظر آئیں۔ وہ ایک دفتر میں ملازم ہیں۔ یہ شاعری کی بدقسمتی ہے یا اُس دفتر کی کہ جس نے ایک شاعر کو

کلرک کا عہدہ دے رکھا ہے ــــ بہرکیف وہ اپنے لباس میں شیروانی کو ہر وقت نتھی کئے رکھتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، وہ مئی جون کی شدید پسینہ بہا گرمی میں بھی دفتر میں تشریف لاتے۔ تو شیروانی پہن کر ضرور آتے۔ ایک دن بلا کی گرمی میں شرابور دفتر میں تشریف لائے تو میں نے اُن کو ہمدردی کے طور پر پوچھا۔
"قبلہ.... صاحب! آپ گرمیوں میں تو شیروانی ترک کر دیا کیجئے۔"

وہ بولے۔" جناب! آپ جانتے ہیں۔ کہ اگر میں شیروانی نہ پہنوں تو مجھے کوئی شاعر مانتا ہی نہیں، ذرا سنیئے، کل رات ایک غزل لکھی ہے کہ......"

میں نے غزل تو سن لی مگر اُسے یہ کہنا موزوں نہیں سمجھا کہ قبلہ! آپ لاکھ شیروانیاں پہن لیجئے، لیکن آپ کی غزل سن کر تو مجھے لگتا ہے، کہ آپ شاعر بھی نہیں ہیں۔ شیروانی کے باوجود نہیں ہیں۔

اب مونچھ کو لیجئے۔ مونچھ خدا کی دین ہے۔ ٹیکسٹائل مل کی نہیں لیکن ہم دونوں نے مونچھ کو اپنے لباس کا ایک حصّہ بنا لیا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک معزز آدمی سے ملاقات ہوئی۔ تو اُن کے چہرے پر ایک بھاری بھرکم مونچھ دکھائی دی۔ میں نے پوچھا" یہ جناب! یہ مونچھ کیسی؟" وہ بولے" یہ مونچھ مرد کا لباس ہے۔ مونچھ کے بغیر مرد، مرد ہی دکھائی نہیں دیتا۔ کیبرے کی ڈانسر دکھائی دیتا ہے۔"

اور پھر چند دن بعد معلوم ہوا کہ اُن کی بیوی نے طلاق کی درخواست دے دی ہے۔ الزام یہ لگایا گیا کہ اس کی مونچھوں سے میرے گلاب ایسے نازک رخساروں کو سخت ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچی ہے۔ اذیت کے اس جرم میں مجھے خاوند سے طلاق دلائی جائے یا خاوند سے کہا جائے کہ مونچھوں کو طلاق دے دیں۔

مجھ سے انٹرویو

میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی - دستک دینے والے نے کال بیل بجائی ہوگی، نہیں بجی ہوگی کیونکہ بجلی ایک گھنٹے سے بند تھی - آج صبح کے اخبار میں بجلی کمپنی (ڈیسو) نے جن علاقوں میں بجلی بند رہنے کا اعلان کیا تھا - اس میں ہماری کالونی کا نام درج نہیں تھا لیکن اس میں ہرج بھی کیا تھا - موسمی رپورٹ میں اگر بارش آنے کا اعلان کیا گیا ہو تو بھی بارش نہیں ہوتی -

جس وقت دستک ہوئی، میں کھڑکی سے سامنے کی چھت پر لانبی لانبی زلفیں اچھالتی ہوئی لڑکی کو حسرت سے دیکھ رہا تھا - حسرت اس لیے کہ لڑکی کے پورے جسم میں سوائے زلفوں کے اور کوئی چیز شباب آگیں نہیں تھی -

دستک نے میری وہ آہیں روک دیں، جو میں اُس زلف باز لڑکی کی طرف اچھال رہا تھا۔ دروازہ کھولا۔ تو ایک لمبا تڑنگا، مگر اُدھیڑ عمر کا انسان اندر داخل ہوا ۔۔۔ دیکھتے ہی یوں لگا، جیسے شباب کے ساتھ بچارا اپنی زلفیں بھی چھڑوا چکا تھا۔ بے اختیار چھیڑ لگانے کے لئے ہاتھ اُٹھ جاتا ہے، تو ایسے ہی سر جو دو تہائی گنجے ہو چکے ہوں۔

اندر آتے ہی اُس کے منہ سے نکلا " اگر میں عظیم افسانہ نگار مکرتونسوی کے سامنے کھڑا ہوں تو کیا میں اُسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں۔"

مجھ سے ملاقات کر کے جو آدمی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہے تو وہ آدھا پاگل ضرور ہوتا ہے ۔۔۔ مگر میں نے اُسے یہ نہیں کہا۔ کتنا خوبصورت فقرہ بے کار میں ضائع ہو گیا۔ بلکہ رسمی فقرہ کہہ دیا، تشریف رکھئے۔ اور ساتھ ہی یہ تعارف بھی ہو جائے۔

وہ بیٹھتے ہی بولا " میں ایک بہت بڑے علمی اور ادبی ادارے کا ڈائرکٹر رہ چکا ہوں۔ گزشتہ سال ریٹائر ہوا ہوں۔"

میں نے بے تکلف ہونے کی خواہ مخواہ کوشش کی۔ " گویا علم و ادب نے آپ سے نجات پائی یا آپ نے علم و ادب سے نجات پائی۔"

ایک کھلا قہقہہ اس کے حلق سے برآمد ہوا (اور یہ تو ہنس بھی نہیں سکتا۔) اور میں نے شکھ کا سانس لیا اور کہا " ویری گڈ! فرمائیے، میرے لائق کوئی خدمت؟"

وہ بولا " میں آپ سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔"

"مجھ سے انٹرویو؟ مگر میرا تو جی چاہتا ہے، میں آپ سے انٹرویو لوں۔ خلاًیہ کہ آپ کے سر سے جو دو تہائی بال اُڑ چکے ہیں کیا انہیں علم و ادب کا آرائش چھین کر لے گیا۔"

جواب میں پھر صاف شفاف قہقہہ اور قہقہے کے بعد یہ اصرار کہ انٹرویو آپ دیجئے، لیجئے نہیں۔ آپ نے زندگی کو جس زاویئے سے طنز کے فارم میں کامیابی سے ڈھالا، تو کیسے ڈھالا؟"

"بس ڈھل گیا۔ مگر کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا۔ ایک دودھ والا ہر روز میرا کام پڑھتا ہے۔ مگر دودھ میں پانی پھر بھی ملاتا ہے۔ بلکہ پانچ سال پہلے جس مقدار میں ملاتا تھا، اب اُس سے ڈیوڑھی مقدار میں ملاتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے آپ یہاں کی محلہ سدھار کمیٹی کے پریذیڈنٹ ہیں۔ آپ پریذیڈنٹ کیوں بنے؟"

"کیونکہ محلے والوں نے آکر مجھے اطلاع دی کہ آپ کے پاس چونکہ اور کوئی کام نہیں رہا۔ اس لئے آپ پریذیڈنٹ بن جائیے۔"

"آپ کی پریذیڈنٹی کے دوران محلے کا کتنا سدھار ہوا ہے؟"

"چندوں اور چوروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔"

وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ چندوں اور چوروں پر بھی ہماری سوسائٹی ہنس ہنس کر لطف اُٹھاتی ہے۔ اس کا علم مجھے زندگی میں پہلی بار ہوا ہے۔ بہرکیف لطف اُٹھانے کے بعد وہ بولے، "ذکر صاحب! ہمارا آج کا سماج کرپشن سے بے حد پریشان ہے، کیوں ہے نا؟"

میں نے کہا یہ بالکل پریشان نہیں ہے۔ ہمارے پڑوس کے ایک وکیل صاحب نے اپنے مکان کا کمپلیشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے سرکاری افسر کو پانچ سو روپے ادا کئے، سرٹیفکیٹ مل گیا تو وہ بے حد خوش تھے۔ بلکہ کل آکر مجھے دعوت نامہ بھی دے گئے کہ سرٹیفکیٹ ملنے کی خوشی میں اپنے گھر میں راماین کی کتھا کروا رہا ہوں۔ آپ ضرور تشریف لائیے گا۔"

وہ یہ سن کے سنجیدہ لہجے میں بول اٹھا "کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے کہ یہ راماین جیسی مقدس پستک کی توہین ہے؟"

میں نے جواب دیا "ایسا میں کیوں سمجھوں؟ میرے پاس یہ سوچنے کے لئے ٹائم ہی نہیں ہے۔"

"ٹائم نہیں ہے۔ آپ دن بھر کیا کام کرتے ہیں؟"

"صبح سیر پر جاتا ہوں۔ سیر پر دوسرے کئی ریٹائرڈ انسان ملتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کی داستانیں سناتے ہیں کہ کالی مرچ کس بھاؤ ملتی تھی۔ گیہوں ایک روپے کا سولہ سیر ملتا تھا۔ بیئر کی بوتل دس آنے میں۔ اور جب ہم کھیت کی تازہ مولیاں اکھاڑتے تھے تو کھیت کا مالک خوش ہوتا تھا۔ دو تین گھنٹے ان کی باتیں سن کر ہنستا اور روتا ہوں۔ گھر لوٹتا ہوں، تو نہانے کے لئے نل میں پانی نہیں ہوتا۔ کیونکہ واٹر سپلائی والے رات کو پانی سپلائی کرتے ہیں کہ نہانا ہے تو رات کو نہاؤ، ورنہ جہنم میں جاؤ۔ چنانچہ میں دریائے جمنا کا رخ کرتا ہوں۔ جہاں پانی بہت ہوتا ہے، میسر نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے اس طرح آنے جانے میں آسانی سے صرف ہو جاتے ہیں پھر گھر لوٹتا ہوں۔ کھانا کھا کر پبلک پارک میں جا بیٹھتا ہوں

اخبار پڑھتا ہوں۔ اخبار میں صرف اشتہار پڑھتا ہوں، خبریں نہیں پڑھتا کیونکہ ہر روز ایک ایسی خبریں ہوتی ہیں۔ ہو جل گئی، بینک لوٹا گیا، دھار ملک جلوس کے باعث ڈیڑھ گھنٹہ ٹریفک رکا رہا۔ پاکستان میں جمہوری الیکشن ہو گئے۔ لیکن ابھی نہیں، کیونکہ ابھی ہے

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں"

تیری باتوں کے تیز رد بہاؤ نے شاید انٹرویو لینے والے کو بور کر دیا۔ بیچ ہی میں ٹوک کر پوچھے۔" نکر صاحب! کیا آپ نے کبھی کسی لڑکی سے عشق ہوا کیا؟"

" اگر آپ ایسے سوال کریں گے، تو میں جھوٹ بول دوں گا۔ کیونکہ ہر انٹرویو میں تیس چالیس فیصدی جھوٹ بولنا پڑتا ہے ۔۔۔ کہیے بول دوں؟"

" نہیں۔"

" تو پھر آپ میرا انٹرویو کیوں لینے آئے ہیں۔"

کچھ قہقہہ نما شگاف۔ بولے۔ دراصل نکر صاحب! ریٹائرمنٹ کے بعد میرے پاس بھی کوئی کام نہیں رہا تھا۔ اس لئے سوچا، وقت گزاری کے لیے آپ کا انٹرویو ہی لے لوں۔ ویسے میرا نام سری رام گپتا ہے۔ آپ کا شکریہ! اب اجازت دیجئے!"

جیو جیو! تنہا تنہا!

میرے ایک نئے نئے دوست بنے ہیں۔ عمر کی ساٹھویں منزل میں ہیں۔ ساٹھ سال تک اپنے آپ کو بھگتانے کے بعد کسی کا دوست بننے میں کوئی تک بھی نہیں۔ کیونکہ یہ عمر تو دوستوں سے تعلقات توڑنے کی ہوتی ہے جوڑنے کی نہیں۔ تاکہ خدا کے پاس جا کر بڑے فخر سے کہہ سکیں کہ خدایا! آپ نے ہمیں دنیا میں اکیلا بھیجا تھا اور اکیلے ہی لوٹ آئے ہیں۔ سارے رشتوں ناطوں سے الگ ہو کر۔

کل وہ دوست گفتگو کرتے کرتے اچانک اداس ہو گئے۔ بولے۔
"فکر صاحب! یہ سوچنا مجھے بڑا دردناک لگتا ہے کہ میں — تنہا ہو گیا ہوں۔ کروڑوں انسانوں کے اندر رہتے ہوئے بھی تنہا۔"
میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! (وہ لٹریچر کے ڈاکٹر ہیں) دماغ

بی کامپلیکس والے ڈاکٹر نہیں۔) آپ کی زوجۂ محترم کو انتقال کئے کتنے سال ہو گئے ؟"

"پانچ سال۔"

"گویا وہ آپ سے پانچ سال پہلے ریٹائر ہو گئیں۔ آپ کے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟"

"ایک امریکہ کی یونیورسٹی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، دوسرے نے کلکتہ میں ایک فیکٹری کھول لی ہے۔ اور اب میرے متعلق پوچھئے، کہاں رہتا ہوں۔؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "آپ رہتے کہاں ہیں، بالکل کہیں نہیں رہتے، آپ تو صرف خواہ مخواہ جی رہے ہیں۔ تنہائی اس میں نہیں ہے کہ آپ کو اپنی فیملی سے جدائی کا غم ہے بلکہ تنہائی تو خواہ مخواہ جینے میں ہے۔ مگر جیسا کہ آپ نے بتایا تھا آپ ایک علمی کتاب لکھنے کے لئے ہندوستان بھر کے دورے کرتے رہتے ہیں۔ گویا آپ تو سرگرم ہیں۔ سرگرمی کے ہجوم میں تنہائی کا یہ احساس کیوں۔؟"

انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری (بعض اوقات ٹھنڈی آہ بھرنے میں کوئی خاص مشکل پیدا نہیں ہوتی) بولے۔ "مگر ہندوستان بھر میں گھومنے کے باوجود مجھے احساس ہوتا ہے کہ سبھی لوگ میرے ساتھ ہیں مگر اس کے باوجود کوئی بھی میرے ساتھ نہیں۔ ہندوستان کا ہر آدمی اکیلا جی رہا ہے۔ دوسرے انسان کے ساتھ اس کا سمبندھ صرف اتنا ہے، جیسے

ایک اکیلے کا دوسرے اکیلے کے ساتھ تو ہے۔ سچ مانئے تو تنہائی کے اس جینے سے تو موت بھلی۔

لیکن موت کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ۔ ؏

موت آتی ہے، پر نہیں آتی

مناسب تو یہ تھا کہ ساٹھ سال کی ریٹائرمنٹ کے بعد انسان ایک صبح اٹھنا چاہتا تو موت اسے اٹھنے نہ دیتی۔ لیکن اس مناسبت میں انسان کا شعور و دانش بری طرح مائل ہو گیا ہے۔ جس نے انسان کو زیادہ سے زیادہ زندہ رکھنے کے آداب دریافت کر کے دے دئے ہیں۔ اور پھر ادھر میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ نت نئی دوائیاں ایجاد کر رہی ہے۔ کہ انسان مرنے ہی میں نہیں آتا۔ وہ تو شکر کیجئے کینسر اور ہارٹ اٹیک ایسے دو کارآمد عارضے ہیں جو انشاء اللہ اب عام ہو رہے ہیں اور کچھ نہ کچھ انسان اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن ہو جاتے ہیں۔ اور یا پھر تشدد اور اہنسا کو مشینی تہذیب کا فارما سمجھ کر کچھ نوجوان میدان میں پستول اور بم سمیت اتر آئے ہیں۔ گولی داغی، بٹوے کے روپلے چھینے اور زخمی نے اسپتال تک جاتے جاتے راستے میں دم توڑ دیا ـــــ اور یوں تنہائی کے غم سمیت فنا ہو گیا۔

پرسوں اخبار میں ایک خبر آئی تھی کہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کو پستول کی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ وجہ تنازعہ باپ کے بینک بیلنس کا روپیہ تھا۔ گویا

رشتہ باپ اور بیٹے میں نہیں تھا۔ بلکہ پیسے اور بیٹے میں تھا۔ پیسہ ہی بیٹے کا اصلی باپ تھا۔

مشینی عہد کی مشین پیسہ کماتی ہے۔ انسان کا بھائی، بہن، بیٹا اور بھتیجا، وہی مشین کا پیسہ ہے۔ پیسے میں جذبات تو ہوتے نہیں۔ لہٰذا پیسے سے رشتہ جوڑیں گے تو آپ کی زندگی جذبات سے الگ ہو جائے گی۔ سارا فساد اسی پیسے کا ہے جو انسان کو انسان سے الگ کئے جا رہا ہے۔ الگ ہوگا تو تنہائی پیدا ہوگی۔ پیسہ تو تنہائی کو دور نہیں کر سکتا۔ پیسے سے آپ مکھن، ملائی، مچھلی خرید لیں گے۔ پیسے سے آپ کرسی، ٹیپ ریکارڈ اور ریفریجریٹر لے لیں گے۔ لیکن اس سے آپ کو وہ تسکین تو نہیں ملے گی، جو بیٹے کو باپ کی گود میں بیٹھنے سے ہوتی ہے۔ جب بیٹا اور باپ الگ الگ ہو رہے ہیں، گود غائب ہو گئی ہے۔ خوشی کو زر و سیم کے ترازو میں تول کر بیچا جا رہا ہے، کیبرے ڈانسر کا رقص اور ننگے جسموں کا کاروبار صرف پیسے کے رشتے سے قائم ہے۔ تو آپ کو چند لمحوں کی وقتی سکون تو مل جائے گا لیکن اس کے بعد پھر تنہائی کا احساس۔

اور تنہائی کا یہ ہندوستان میں پھیلتا بڑھتا خزانہ ــــ مجھے تو خطرہ ہے کہ یہ ہندوستان کو تڑپ کر جائے گا۔ اگر ہندوستان کا ہر آدمی الگ الگ جینے لگا اور الگ الگ جینا شروع ہو گیا ہے۔ کسی کو کسی پر بھروسہ اعتماد نہیں رہا۔ کسی سے کام کروانا ہو یا آپ نے کسی کا کام کرنا ہو، تو درمیان میں پیسہ آ جھمکتا ہے۔ چلو، پیسے سے آسانی ہو گئی، کام بخیر و خوبی نمٹ گیا۔ لیکن ......

" لیکن یہ بھی سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب! میں نے اس تنہائی زدہ سٹے

دوست سے کہا" کام تو بخیر و خوبی نبٹ گیا لیکن اس کے بعد تنہائی نے آپ پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیئے اور آپ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے میں پوچھتا ہوں، آپ اپنے بیٹوں سے کیوں الگ ہو گئے ـ"

وہ بولے ـ" میں نہیں، وہ الگ ہو گئے ـ"

" کیوں ہو گئے آخر؟ آپ انہیں روک کیوں نہیں سکتے ـ"

اس نے جواب دیا" فکر صاحب! آپ کی سوچ بوڑھی ہو گئی ہے ـ بیٹا نوجوان ہو جائے ـ تو وہ الگ جینے لگتا ہے ـ اسے زبردستی روکنا اس صنعتی دور میں جہالت ہے ـ"

ہم دونوں اس ریستوران سے چائے پی کر باہر نکلے تو باہر فٹ پاتھ پر ایک مفلوک الحال بوڑھا بیٹھا مونگ پھلیاں بیچ رہا تھا لیکن مونگ پھلی کے ساتھ منہ سے سسکیاں اور ہچکیاں کیوں؟ میں نے پوچھا" باباجی! آپ کو کوئی دکھ ہے کیا؟"

وہ بولے" ہاں بابوجی، اس دنیا میں مجھے میری تنہائی کھا رہی ہے ـ"

کیا آپ کی فیملی میں ....؟"

وہ بابا جیسے زور سے چیخ کر بولا" سب چھوڑ گئے مجھے ـ حرامی ہیں، خود غرض، ٹکے ٹکے کا حساب جوڑنے والے اے بھگوان! آخر تو مجھ اس تنہا انسان کو اس دنیا سے اٹھا کیوں نہیں لیتا" مگر دوسرے کے بھگوان کی بجائے ڈیوٹی کانسٹیبل آگیا اور اس نے ڈنڈے مار کر اس بوڑھے کو فٹ پاتھ سے اٹھا دیا ـ کہ بغیر سرکاری اجازت کے خوانچہ لگانا جرم ہے ـ

ڈنڈے سے خوانچے کی مونگ پھلیاں فرش پر گر گئیں ـ بوڑھا روتا دھوتا چلا تا گیا ـ وہ اپنی مونگ پھلیوں سے بھی الگ جینے کے لئے چلا گیا ـ تنہا ہو گیا ـ

کتابیں پڑھنا

ہر صبح میرے گھر کے سامنے سبزی فروش اپنی ریڑھی لگا کر صدا لگاتا ہے: "بینگن لے لو، آلو لے لو، ٹماٹر، پیاز، گوبھی!"

اور میری بیوی یوں جذباتی انداز میں اس کی طرف بھاگتی ہے، جیسے بینگن اور ٹماٹر کے ساتھ ہنی مون منانے جا رہی ہو۔

حسرت سے میرا جی چاہتا ہے: کاش! کبھی ایسا ہو جائے، سبزی فروش کی صدا سنائی دے: "دیوانِ غالب لے لو۔ ٹیگور کی گیتانجلی لے لو، فیض، ساحر، حسرت کا کلام!"

ایک دن سبزی فروش کے سامنے میں نے اپنی زرّیں تجویز پیش کی تو وہ مجھے شاید احمق سمجھ کر کہنے لگا: "بابو صاحب! غالب اور ٹیگور کوئی عورت نہیں خریدتی۔ مگر بینگن اور آلو خرید لیتی ہے اور آپ جانیے، یہ میری روٹی روزی کا

دھندا ہے اور سچ پوچھئے تو بینگن اور آلو کے مقابلے پر ٹیگور اور غالب کی وقعت ہی کیا ہے ؟"

میں نے مزید معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ سبزی بیچنے والا بی۔ اے پاس تھا۔ ملازمت نہ ملی (اور ایم۔ اے کے ڈگری یافتوں تک کو نہیں ملتی) تو اس نے سبزی بیچنے والوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اعلیٰ تعلیم نے اسے سماج کا اقتصادی شعور عطا کر دیا تھا۔ کہ لوگوں کے ماہانہ بجٹ میں آلو، گوبھی خریدنے کی آئیٹم تو رکھی جاتی ہے، کتاب خریدنے کی نہیں۔ کتاب ایک ایسی آئیٹم ہے کہ خریدی جائے تو وہ بے کار پڑی رہتی ہے۔ کتاب سے تو سبزی تک نہیں پکائی جاتی۔ اس لئے جس آئیٹم کا کوئی مصرف نہ ہو۔ اسے خریدنے کا کیا فائدہ ؟

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کتاب کوئی خریدتا ہی نہیں۔ میرے ایک امیر دوست ہیں (کم از کم وہ مجھے اپنا دوست کہتے ہیں ورنہ امیری اور غریبی میں دوستی کیسی ؟) انہوں نے ایک مرتبہ مجھے اپنی نئی کوٹھی دکھانے کی دعوت دی۔ ایسے حضرات اپنی نئی کوٹھی کے لئے یوں دعوت نامے بھیجتے ہیں جیسے اپنی بیٹی کا بیاہ کر رہے ہوں۔ کوٹھی دکھاتے دکھاتے وہ مجھے اپنی اس الماری پر لے گئے جو نئی حسین اور مجلد کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں کتابیں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور پوچھا "مرلی دھر جی یہ کتابیں اور آپ ......"

"ہی ہی ہی۔ اجی۔ میرے آرکیٹیکٹ نے کہا تھا کہ ماڈرن آرکیالوجی میں، کوٹھی میں بک شیلف کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس سے مالک کے ذوقِ بلندی کا احساس ہوتا ہے۔"

"صرف احساس؟ یا ابھی آپ ان کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔؟"

"کہاں جی؟ سالا وقت ہی نہیں ملتا۔ صبح سے شام تک بزنس کے ہزاروں جھنجھٹ دم ہی نہیں لینے دیتے۔"

"تو پھر اتنی ساری کتابیں خریدنے سے مطلب؟"

"صرف سوشل اسٹیٹس۔"

میں ان ذوقِ مطالعہ رکھنے والوں سے اپیل کرتا ہوں جو صرف بینگن خرید سکتے ہیں کتابیں نہیں۔ وہ متری دھرجی کی کیفی کا رخ کریں اور ان سے پڑھنے کے لئے کتابیں مانگ کر لے آئیں۔ مانگنے سے آپ کا سوشل اسٹیٹس تو گھٹے گا ہی۔ لیکن متری دھرجی کا سوشل اسٹیٹس بڑھ جائے گا۔

ہمارا ملک جو اللہ کے فضل سے غیر ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کتاب کے سلسلے میں تین طبقے ہیں (۱) کتاب خریدنے والے (۲) کتاب مانگ کر پڑھنے والے (۳) کتاب چرانے والے ۔۔۔ اور ان تینوں طبقوں کی کرم فرمائی ہے کہ ہمارے ملک کے پبلشرز کتابیں چھاپے جارہے ہیں اور بیچے جارہے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے ایک پبلشرز سے پوچھا "آپ کتاب چھاپتے ہیں تو بیچتے کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جن کی ماہانہ آمدنی تین یا چار ہزار روپے ہوتی ہے۔ کتابیں نہیں خریدتے بلکہ بینگن خریدتے ہیں۔"

وہ بولا "اجی، سرکار کے کئی محکمے اور لائبریریاں ہیں، ہم تو ان کے ہاتھ کتابیں مڑھ دیتے ہیں۔"

"سرکار کیوں خریدتی ہے؟"

" تاکہ لوگ کتابیں (مفت ہی سہی) پڑھنے کی عادت پیدا کریں ۔"

اور پھر اس نے مجھے کان میں بتایا کہ گزشتہ دنوں اس نے ایک سرکاری محکمہ کے ہاتھ پانچ ہزار روپے کی کوڑا کرکٹ کتابیں بیچ دیں جو شاید ردی میں بھی نہ بک سکتیں ۔

" سرکار نے ایسی ردی کتابیں کیسے خرید لیں ؟"

" اجی سرکار بڑی فراخدل ہے ۔ خریدنے والے سرکاری افسر کے ساتھ " چائے پانی " کا فیصلہ کر لیا اور اس نے مجھے سپلائی کا آرڈر دے دیا ۔"

اور یہ سن کر مجھے لوگوں کے ذوق مطالعہ کی داد دینا پڑی ۔ جب پبلشرز نے بتایا ۔ اجی لوگ یہ ردی کتابیں بھی پڑھ لیتے ہیں اور تعلیم یافتہ کہلانے لگتے ہیں ۔ ○

میری پرابلم قدرے مختلف ہے کہ میں کتابیں اور رسالے خریدتا نہیں بلا سے یہ قابلِ ندامت فعل ہو ۔ لیکن ندامت بھی تو ایک نیچرل چیز ہے ۔ ہر انسان کسی نہ کسی بات پر نادم ضرور ہوتا ہے اور برا نہیں مانتا ۔ لیکن ایک مرتبہ ایک لائبریری سے میں نے ایک کتاب چرائی ضرور تھی کیونکہ مجھ پر جوانی اور غریبی بیک وقت وارد ہوئی تھی ۔ وہ چرائی ہوئی کتاب آج کل میرے پاس نہیں ہے شاید کوئی اہلِ ذوق چرا کر لے گیا اور اہلِ ذوق کو میں چور نہیں سمجھتا ۔

یا ممکن ہے ، وہ چرا کر نہ لے گیا ہو ، مجھ سے مانگ کر لے گیا ہو ۔

مانگ کر لے جانے والے ہمیشہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ تین دن کے بعد یقیناً لوٹا دیں گے۔ لیکن کتاب ایک چلتی پھرتی چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ تین دن بعد اس کا کوئی اور دوست یا واقف کار مانگ کر لے گیا ہوگا کہ تین دن کے بعد یقیناً لوٹا دوں گا۔ اس کے بعد وہ کتاب کسی اور صاحب کے پاس تین دن کے لئے مانگ کر لے جائی گئی ہوگی۔ یہ تین دن بہت طویل ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ تین سال تک پہنچ جاتے ہیں، اور ہو سکتا ہے، تین سال بعد آپ چاندنی چوک کے فٹ پاتھ پر سے گزریں تو ردی اور پرانی کتابیں بیچنے والے کے ہاں آپ کو پڑی ہوئی دبی کتاب مل جائے اور وہ پچیس پیسے میں یہ کہہ کر بیچ دے "صاحب! یہ بڑی کلاسیکل کتاب ہے اور اسے اکبر بادشاہ پڑھا کرتا تھا۔"

اور آپ یہ سوچ کر کبھی اپنی وہ کتاب خرید لیں کہ اکبر بادشاہ تو ان پڑھ تھا۔

کل ایک نوجوان لڑکا میرے گھر آیا۔ اس کے والد صاحب جو میرے دوست تھے۔ چند مہینے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ نوجوان نے مؤدبانہ کہا: "انکل! آپ اردو زبان جانتے ہیں نا؟"

میں نے آہ بھر کر کہا: "بدقسمتی سے جانتا ہوں۔"

وہ بولا "تو میرے گھر میں اردو کی یہ کتاب پڑی تھی۔ والد صاحب چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو اردو کوئی نہیں جانتا۔ سوچا اسے ردی میں کیوں بیچیں۔ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔"

میں نے کتاب لے کر اسے اطمینان دلا دیا کہ جب میری آپ کے والد صاحب سے ملاقات ہوگی یہ ردی امانت اُن کی نذر کر دوں گا۔"

ایک سو روپے میں لاش

کل ہم نے ایک نوجوان کی لاش ایک سو روپے میں خریدی۔ مجھے تو ریٹ بے حد سستا لگا۔ کیونکہ اگر ہم ایک ہاتھی کی لاش خریدتے تو وہ سوالاکھ روپے سے کم میں نہیں ملتی۔ بلکہ افراط زر کے موجودہ دور میں اگر ہاتھی کے ساتھ مہنگائی الاؤنس بھی لگایا جاتا۔ تو وہ کمبخت سوالاکھ سے بھی مہنگا ملتا۔

اور یوں بھی مارکیٹ میں جانور کی قیمت انسان سے زیادہ ہے۔ خدا نے انسان کو خواہ مخواہ اشرف المخلوق کا مرتبہ دے کر بے وقوف بنا رکھا ہے۔ ورنہ دیکھ لیجئے، انسان کی قیمت ایک سو روپے اور ہاتھی کی .....؟

بہرکیف میں اس نوجوان کی داستان سناؤں گا۔ جس کی داستانِ حیات ختم ہو چکی ہے۔ وہ خوبرو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ حالانکہ خوبروئی

اور اعلیٰ تعلیم دونوں ایک ساتھ کبھی اکٹھی نہیں ہوتیں۔ کیونکہ یہ دنیا کا اصول ہے۔ (لگتا ہے خدا بھی اب اپنے اصول توڑنے لگا ہے)

وہ نوجوان ستائیس برس کا تھا۔ اس کے ساتھ دو ٹریجڈیاں ہوئیں نہیں بلکہ تین ہوئیں۔ پہلی ٹریجڈی تو یہ ہوئی۔ کہ وہ بہت نیک نفس تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک سرکاری محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر متمکن ہو گیا۔ حالانکہ سرکار کی اعلیٰ کرسی پر نیک نفسی کا کیا کام؟

دوسری ٹریجڈی یہ ہوئی کہ بیاہ کی خوشخبری لڑکیوں نے اس پر سہرا لیل دیا..... حالانکہ آئین میں مرد اور عورت کا درجہ اور منزلت برابر ہیں۔ لیکن شادی جب تجارت کی ایک جنس بن جائے تو ــــ کانسٹی ٹیوشن کی قیمت صفر نہیں رہتی۔ لڑکیاں یہ بھی جانتی ہیں کہ شادی کے چند ماہ بعد انہیں مٹی کے تیل سے جلا دیا جائے گا۔ اس لئے شاید شادی کے جال میں پھنسنے کے لئے بھی وہ اعلیٰ عہدیداروں پر ہاتھ ڈال دیتی ہیں ــ اور مذکورہ نوجوان تو بدقسمتی سے پاک طینت بھی تھا۔ جس کے لئے مٹی کا تیل الگ چیز تھی اور بیوی ایک الگ چیز۔ بہرکیف دوسری ٹریجڈی کہ اس نے شادی کر لی۔

اور تیسری ٹریجڈی یہ ہوئی کہ شادی کے دس دن بعد ایک بائیس منزلہ بلڈنگ کے نیچے اس کی لاش پائی گئی۔ کہتے ہیں کہ خودکشی کرنا ہو تو لوگ اب قطب مینار کا رخ نہیں کرتے۔ سماج نے اکتیس اکتیس منزلہ بلڈنگیں بنانا شروع کر دی ہیں جن سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی جائے۔ یا کوئی اسے دھکا مار کر کہے کہ چھلانگ لگا دو۔ کیونکہ یہ سوسائٹی ہمارے ایک ایسے

نیک نفس نوجوان کے لئے موزوں نہیں ہے ۔"

بہر کیف جو ملانگ یا دھکا کوئی بھی ذہنی انتشار ۔۔۔ نتیجہ اس لاش کی شکل میں نکلا۔ جو بلند پایہ بلڈنگ کے نیچے پائی گئی۔ پولیس (جو ہمیشہ لیٹ پہنچتی ہے) رشتے دار (جو آنسوؤں کے ذریعہ لاش کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتے ہیں) رپٹ، ہسپتال، پوسٹ مارٹم، مردہ خانہ، اضطراب، انتظار ۔۔۔ سب کچھ اُس نوجوان کی لاش کو بھگتنا پڑا۔ اُس لاش کو جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں بھگت رہا ہوں۔ لاش بننے کے بعد بھی انسان کو یہ سب کچھ بھگتنا پڑتا ہے ۔ کیونکہ قواعد وضوابط کا بھی پیچھا نہیں چھوڑتے ۔

ہسپتال کے مُردہ خانہ میں اُس نوجوان کی لاش کو بہت سی لاشوں کے اوپر یوں پھینک دیا گیا۔ جیسے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں کوڑے کا ایک ڈبہ اور پھینک دیا جائے ۔ لاشوں کے ڈھیر میں سے کسی لاش نے پروٹسٹ نہیں کیا۔ زندہ انسانوں میں چاہے نہ ہو مگر لاشوں میں بڑا بھائی چارہ ہوتا ہے ۔

نوجوان کے باپ نے پوچھا "ہمیں بیٹے کی لاش کب ملے گی ؟"
ایک ادھیکاری نے میلے کچیلے دکاندار کے سے لہجہ میں کہا "ڈاکٹر صاحب آئیں گے، پوسٹ مارٹم ہوگا، اُس کے بعد لاش ملے گی ۔"
" ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے۔ کاش! اس کا آج پوسٹ مارٹم ہو جاتا ۔"
" آج نہیں مل سکتی ۔ قاعدہ قانون ٹوٹ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب بھی آج نہیں

آئیں گے، قاعدہ قانون ٹوٹ جائے گا۔ کل صبح نو بجے آجائیے، رات بھر یہ لاش مردہ خانے میں رہے گی۔"

باپ کو بیٹے کی لاش سے الگ کر دیا گیا۔ الگ کرنے والے سرکاری قاعدے قانون پر عمل نہ کیا جائے۔ تو سرکار حکومت نہیں کر سکتی۔ اور کہتے ہیں، باپ اور رشتہ دار سرد رات میں ذات پات پر پڑے رہے۔ لاش نہ ہی لاش کی قربت کا احساس ہی ہی۔ باپ اپنے دل کو مردہ خانہ سمجھ کر بیٹے کی لاش کے تصور کو ہی ڈالے پڑا رہا۔ اندر ٹھٹھرتا رہا۔ باپ بیٹے میں محبت کی لہریں ہوتی ہیں۔ یہ لہریں اُس کے آنسوؤں اور ہچکیوں کی رفاقت میں رات بھر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بھی چلتی رہیں۔ سرکاری قواعد و ضوابط محبت کی ان لہروں سے محروم ہوتے ہیں۔ کسی کی بھی لاش ان کے لئے ایک "روٹین" ہوتی ہے۔ جیسے بھوکے آدمی کے لئے بھوک کے ساتھ سو جانا ایک روٹین ہوتی ہے۔

صبح نو بجے بھی ڈاکٹر نہیں آیا

دس بجے بھی نہیں آیا۔

گیارہ بجے اس لئے آیا کیونکہ بھرپور ناشتہ سے پیٹ بھرنے کے بعد اُسے اور کوئی کام نہ تھا۔

اور پھر ہسپتال کے چار پانچ ادھیکاری، ایک ڈاکٹر ۔۔۔ ذاتشند لاش کا پوسٹ مارٹم کرتے رہے۔ کچھ یوں جیسے یہ اُن کا روزمرہ کا معمول ہو۔ پوسٹ مارٹم ختم ہونے کے بعد ایک ادھیکاری روتے، سسکیاں بھرتے باپ کے پاس آیا۔ "لیجئے، یہی ہے نہ آپ کے بیٹے کی لاش۔"

باپ نے نحیف و نزار سی "ہاں" کردی۔

ادھیکاری بولا۔"تو جائیے، لاش لے جائیے، لیکن پہلے ایک سو روپے نقد دے دیجئے۔لاش جب ملے گی۔"

میں نے کہا۔"وہ کس خوشی میں بھائی!"

وہ بولا۔"خوشی کیسی؟ یہ رواج ہے اور عام ہے۔آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہر لاش کا بھاڑا ایک سو روپیہ ہوتا ہے۔لگتا ہے پہلی بار کوئی لاش لینے آئے ہیں۔نکالیئے، نکالیئے ایک سو روپے۔"

"کیا یہ سرکاری ریٹ ہے؟"

"عجیب آدمی۔سرکاری شرکاری کیا؟ مجھے ہی سرکار سمجھ لو۔لاش لینی ہے تو ایک سو روپیہ دینا پڑے گا۔کیا ایک بیٹے کی لاش ایک سو روپے میں مہنگی ہے؟"

باپ نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"دس دس روپے کے دس نوٹ دیکھے جو آپس میں بانٹتا ہے۔"

اور ادھر ایک ریڈیو پر ہیلتھ منسٹر کی تقریر ہو رہی تھی۔

"میں عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے محکمہ میں ہر طرح کی کرپشن دور کر دوں گا۔ ورنہ وزارت سے استعفیٰ دے دوں گا۔"

اُوٹ پٹانگ باتیں

اس مرتبہ میں اوٹ پٹانگ باتیں کروں گا۔

اوٹ پٹانگ باتیں کرنا، ہر انسان کے خمیر میں ہے۔ ہر انسان میں وہ شرفا شامل نہیں ہیں، جن کی ہر زمانے میں قلت رہی ہے۔ بہرکیف ان شرفا سے کچھ مستثنیٰ بھی ہوتے ہیں — جیسے میں!

میرے گھر کی منڈیر پر ہر صبح ایک کوا آ کر بیٹھتا ہے۔ کوؤں کے اتہاس میں شاید یہ پہلا کوا ہے جو کائیں کائیں نہیں کرتا۔ چنانچہ آپ اس کوے کو استثنا میں شمار کر سکتے ہیں۔ میری منڈیر پر دوسرے کوے بھی "وزٹ" (VISIT) کرتے ہیں۔ مگر وہ اس تپاسک کوے کی طرح مراقبے میں نہیں بیٹھ جاتے۔ وہ بڑی جلدی میں ہوتے ہیں۔ مراقبے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں وہ مشینی عہد کے کوے ہیں۔ ان کا پروگرام مندرجہ ذیل ہوتا ہے۔

۱۔ تشریف لائے کائیں کائیں کی —— کہ با ادب باملاحظہ ہوشیار!

۲۔ السلام وعلیکم کے بعد وعلیکم السلام کا انتظار بھی نہیں کرتے۔

۳۔ آنگن میں اترے۔ ننھا بچہ ہاتھ میں بسکٹ! ڈائرکٹ جارحانہ حملہ!!

۴۔ مالِ غنیمت چونچ پر لادے، پر پرواز تولے۔ کائیں کائیں کائیں یعنی سے

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ظاہر ہے بچہ رونے لگتا ہے اور میں اسے جبر و اختیار کی فلاسفی سمجھانے لگتا ہوں۔

"ننھے! جانتے ہو، کوا غاصب ہے اور تم بے بس ہو۔"

"نہیں بچہ نہیں جانتا۔ اسے فلسفے کی جانکاری نہیں چاہیئے بسکٹ چاہیئے۔"

چنانچہ وہ بدستور روئے جاتا ہے۔

"اور کیا یہ بھی نہیں جانتے کہ رونے کا منبع تمہارے اندر کیوں پیدا کیا گیا؟"

جواب میں —— سسکیاں

"تو سنو۔ یہ غاصبوں کی ہی نوازش ہے کہ وہ بے بسوں کو رونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر غاصب نہیں ہوتے تو تم رونے سے ہی محروم رہتے۔ یاد رکھو رونا فطرت کی دین ہے اور کوّوں کو قوانین فطرت پر عبور حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانی فطرت میں ایک جبر کا قانون ہوتا ہے۔ ایک صبر کا۔ لہٰذا تمہیں وہ صبر عطا کرتے ہیں، بسکٹ چھین لے جاتے ہیں۔ رونا عطا کرتے ہیں۔"

میری بیوی ننھے کے ہاتھ میں ایک اور بسکٹ تھما دیتی ہے۔ بچہ چپ

تو ہو جاتا ہے ۔ مگر بار بار خوفزدہ نگاہیں اٹھا کر منڈیر کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے ۔ کہیں ۔ رونے کا موقع پھر اہم نہ ہو جائے ۔

مگر منڈیر پر فقط وہی مراقبہ زدہ کوا بیٹھا ہوتا ہے ـــ غاصبوں کی مستثنیات!

میں بیوی سے کہتا ہوں ۔" تم نے پھر ننھے کے ہاتھ میں بسکٹ دے دیا ۔!

" اب کوئی جارح کوا یہاں نہیں آ سکے گا ۔"

" کیسے نہیں آ سکے گا ۔ ؟"

" کیوں کہ اس کے پاس وقت کی قلت ہے ۔ انہیں کئی گھروں میں چاندماری کرنا ہوتی ہے ۔ اگر وہ بار بار ایک ہی گھر پر قسمت آزمائی کرتے رہیں تو ان کا سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے ۔ وہ مشینی عہد کے کوے ہیں ۔ بڑی جلدی میں ہوتے ہیں ۔ اگر وہ اس بے وقوف کوے کی طرح مراقبے میں بیٹھے رہیں ۔ تو دنیا کہیں سے کہیں آگے نکل جائے ۔ کوئی بھی بسکٹ ان کی چونچ تک نہیں پہنچ پائے گا ۔

میری بیوی گیان کا بھنڈار ہے ۔ گیان کی یہ واردات اس پر کب گزری کیوں گزری ؟ میں کیسے جانتا کہ مشینی راکٹ کی رفتار سے چلی اور میری سمجھ کچھوے کی چال ـــ صرف اتنا یاد ہے کہ میرے اور اس کے درمیان رشتۂ محبت استوار تھا ۔ ہم دونوں محبت کے مراقبے میں تھے ۔ آنکھیں بند کیے ، اپنی شفاف اور مفرح روحوں کے ساتھ ـــ مگر پھر اچانک ایک دن کیا ہوا کہ میں نے مراقبے کی سی شاعری کے لہجے میں اسے کہا " جانِ من جی چاہتا ہے ، تمہارا ایک بوسہ ناچیز کی طرف رجوع فرمائیے ۔ کیوں کہ روح ذرا سی دگرگوں ہے ؟"

وہ بولی ۔" میرے پاس فرصت نہیں ہے ۔"

" تو کیا بوسہ ایک راکٹ ہے! اگر دم بھر کے لئے کسی کے لبوں پر رُک گیا، تو نظامِ شمسی کی پوری سائنس میں خلل پڑ جائے گا؟ میں اداس ہو گیا۔ پوچھا۔" فرصت کیوں نہیں ہے ؟"

کہنے لگی۔" دیکھتے نہیں سپر بازار سے جو چادر مہینے کے لئے لائی تھی۔ اس میں کیڑے ہیں۔ ابھی جا کر سپر بازار کو لوٹا نہ آئی تو ساڑھے سات بجے دوکان بند ہو جائے گی۔"

اور وہ برق رفتاری سے سپر بازار کی طرف بھاگی۔ سپر بازار پہلے، بوسہ بعد میں۔ اور پھر بوسے کا کیا ہے؟ عطا نہ کیا گیا تو اس سے نظامِ شمسی میں کوئی خلل نہ پڑے گا۔ سوال ٹائم کا ہے۔ بوسے کا کوئی ٹائم نہیں مگر سپر بازار کا ٹائم معین ہے۔ ساڑھے سات بجے تک کپڑے ضرور لوٹا دینے چاہئیں۔ ورنہ قواعد و ضوابط کے تحت کپڑے واپس نہیں لیے جائیں گے۔ وقت تیزی سے ٹِک ٹِک ٹِک کئے جا رہا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ گذرتا ہوں کی لاش ہی لانگھ کر آگے بڑھتا ہے۔

ایسے میں بوسۂ محبت کی فرصت کسے؟ اور کیوں؟ کہ ع،

ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

میں نے ایک مفکر سے پوچھا۔ جو ایک عبادت خانے کی بلندی اور آسمان کی بلندی میں کوئی ہم آہنگی تلاش کرنے میں مصروف تھا۔" قبلہ! کیا لفظ اپنے مفہوم بدل لیتا ہے یا کھو بیٹھتا ہے۔؟"

اس نے جواب دیا۔" جب تہذیب پینترے بدلتی ہے۔ تو لفظ بھی اپنا

مفہوم کھو بیٹھا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خود لفظ ہی کھو جاتا ہے۔

فرطِ عجز سے میرے پسینے چھوٹ گئے۔ ایسی عمیق گہرائیاں مفکروں کے نصیب میں لکھ دی گئیں؟ نارمل انسان کے پلے تو کچھ پڑتا ہی نہیں۔ چاول اور کپڑے اور پیسے کی بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کے پیچھے وقت ہے جو انسانوں کے رشتوں میں خلل ڈال رہا ہے۔ مجھے اس جیب کترے کی بات بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ جو ایک تھوانے دار کے قریب بیٹھا ہوا شکوہ کر رہا تھا "اجی صاحب! ایک کام کرنے کو میرا بھی جی چاہتا ہے۔ لیکن آہ! کیا کروں، ٹائم ہی نہیں ملتا۔ جیبیں کاٹتے کاٹتے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آسمان والے کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

"کیا چند منٹ بھی شکرانے کے لئے نہیں بچتے؟"

"اجی! آپ کو جیب کاٹنا پڑے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ مثلاً آج چھ جیبیں کاٹنے کا کوٹہ تھا۔ مگر صرف چار کاٹ سکا"۔

"باقی دو جیبیں کیوں نہیں کاٹ سکے؟"

"ان کے پاس بھی جیبیں کٹوانے کے لئے ٹائم نہیں تھا۔ بس کے کیو میں ایک صاحب کا آدھ گھنٹہ تک تعاقب کرتا رہا۔ کہ جونہی بس آئے گی۔ بھگدڑ مچ جائے گی۔ اور وہ جونہی بس پر چڑھنے میں مصروف ہو جائے گا میں اس کی جیب کاٹنے میں مصروف ہو جاؤں گا۔ مگر آہ! بس کم بخت آئی ہی نہیں — اور میں کہ ذرا کی ذرا ایک سگریٹ سلگانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اتنے میں وہ صاحب قطار سے نکل کر ایک اسکوٹر میں بیٹھ گئے تھے۔ اور بھاگ گئے تھے۔ یعنی آنکھ چوکی اور بہار لال غائب! پورا آدھ گھنٹہ اکارت گیا۔

تھانیدار نے مذاق میں کہا۔ "ویسے اس صاحب کو اسکوٹر میں بھاگنا نہیں چاہیئے تھا۔"

"نہیں اس بے چارے کا بھی قصور نہیں۔ اس کے پاس تو ٹائم کی قلت تھی۔ جیب کٹوانے کے لئے اس نے آدھ گھنٹہ انتظار کیا۔ کیا یہ کم چھوٹ تھی۔ آخر کہاں تک انتظار کرنا ممکن ہے، سینما ہال کے باہر اس کی محبوبہ انتظار کر رہی ہو۔ فلم شو تو عین وقت پر شروع ہوتا ہے۔ اہل محبت کے ساتھ رعایت تھوڑے کرتا ہے۔ تھانیدار صاحب! آپ تو اپنے جیب کترے کے لئے میرا انتظار کر سکتے ہیں۔ لیکن ماڈرن زمانے کی محبوبائیں تھوڑے انتظار کرتی ہیں۔ جب بھی میں آیا اسی کے ساتھ سینما ہال میں گھس گئیں۔"

تھانیدار کو طیش آیا۔ اس نے جیب کترے کو گالیاں دینی شروع کیں۔ ابھی پانچ چھ گالیاں ہی دی تھیں، کہ ایک دم چپ ہو گیا۔

جیب کترے نے کہا، حضور! کچھ گالیاں اور ارشاد کیجئے۔

"میرے پاس گالیاں دینے کے لئے اتنا وافر ٹائم نہیں ہے مجھے کچھ دوسرے جیب کتروں کو بھی گالیاں دینی ہیں، لاؤ میرا حصہ حوالے کرو۔ ورنہ تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔"

وہ بولا۔ "جناب! میرے پاس جیل جانے کے لئے وافر ٹائم نہیں ہے۔ میرا وقت جیل جانے سے زیادہ قیمتی ہے۔ جتنی مدت جیل میں رہوں گا دنیا میں جیب کتری کا فن کئی منزلیں طے کر چکا ہوگا۔ اور میں پچھڑ جاؤں گا..... لہٰذا اپنا حصہ اور چپکے ہندرا!"

جیب کترا چلا گیا اور قاتل کمار حسینہ کا پیچھا کرنے لگا، جو اپنی نازک گوری کلائی میں اپنا پرس جھلاتے ہوئے جا رہی تھی۔ اور تھانیدار بھی اپنی موٹر سائیکل کو کک لگا کر قریبی چوک کی طرف چلا گیا، جہاں ایک مجمع خلافِ قانون، منتشر ہونے کے لئے لاٹھی چارج کا انتظار کر رہا تھا۔ تھانیدار کو جلدی تھی، مجمع کو بھی جلدی تھی۔ مجمع کو ایک گھنٹہ کا معاوضہ دیا گیا تھا۔ آئندہ ایک گھنٹہ سے زیادہ انتظار کیوں کرتا۔ انہیں کئی اور جگہوں پر لاٹھی چارج کرانے کے لئے جانا تھا۔

مشین کی سی تیزی سے اگر لاٹھی چارج نہ ہو تو مجمع خلافِ قانون مجبور ہو کر خود ہی منتشر ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی کے ہر شخص کا وقت بیش قیمت ہو گیا ہے۔

ایک لیڈر اپنے سیکرٹری کو ادھر کر کے بتانے لگا۔ "ہاں صاحب، وہ پچھلے زمانے لد گئے۔ جب جلسہ گاہ میں سامعین قومی جذبے سے پہروں پہروں میری آمد کا انتظار کرتے تھے۔ اور میں ٹھیک جلسہ گاہ میں آدھ آدھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچتا تھا تاکہ میری اہمیت سامعین پر نقش ہو جائے۔"

"اب کیا ہوتا ہے۔"

"اہمیت نقش بر آب ہو جاتی ہے۔ سامعین بڑے بے صبر ہو گئے ہیں۔ جلسہ گاہ سے ہی اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔"

"کہاں چلے جاتے ہیں۔"

"کچھ بس اسٹاپ پر چلے جاتے ہیں کہ کہیں بس نہ نکل جائے، کچھ سینما گھروں کی طرف، کچھ راشن اسٹاپ کی طرف بھاگتے ہیں۔ کہ کہیں سائنڈ شو ہی نہ گزر جائے۔ اور اگر کچھ بچ بھی جاتے ہیں تو کسی اور لیڈر کی جلسہ گاہ کا رخ کر لیتے

ہیں۔ وقت ہی صرف کرنا ہے تو کسی اور لیڈر پر سہی۔ اس لئے جناب! میں تو آج کل ہمیشہ وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے جلسہ گاہ میں پہنچ جاتا ہوں۔"

میں نے تفریحاً پوچھا "کیا جلسے میں آپ پر گندے انڈے بھی پھینکے جاتے ہیں۔"

وہ بولا "اب انڈوں کی ایک ٹریجڈی سنیئے۔ ایک مرتبہ میں جلسہ گاہ میں صرف دس منٹ لیٹ پہنچا۔ سامعین سے معذرت کی۔ گھبرائے ہوئے گلے سے کہا، حضرات! آپ اس جرم میں مجھ پر گندے انڈے پھینکیں تو مجمع میں سے ایک آواز گونجی۔ کہ میرے پاس انڈے پھینکنے کے لئے نہ تو وقت نہیں ہے۔ آپ تقریر شروع کیجئے۔ گندے انڈے اور کسی موقع پر سہی۔"

قارئین کرام! مجھے کچھ عرصہ سے یوں لگ رہا ہے جیسے سوسائٹی کا ہر فرد بڑی جلدی میں ہے۔ سمت کا تعین نہیں ہے مگر پھر بھی جلدی جلدی جا رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں جا رہا ہے۔ آپ کسی سے اگر پوچھ بھی بیٹھیں "میاں! کہاں جا رہے ہو" تو وہ فوراً جواب دے گا۔ "یہ بتانے کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

"ٹائم کہاں گیا؟ گھڑی کی ٹک ٹک تو جاری ہے۔ یعنی ٹائم تو موجود ہے مگر ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ وہ موجود اور ناموجود میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ ایک بس اسٹاپ پر میں نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ کے بوسے نے کا بجیٹ نوجوان کی طرف رجوع کیا مگر آدھا بوسہ بس اسٹاپ پر رہ گیا۔ آدھا بس پر سوار ہو گیا۔ وقت کی قلت میں زمانے شہر کے کتنے لطیف اور معطر بوسے ادھورے رہ گئے۔ بوسہ

توخیر ایک اظہار محبت ہے ۔ جو وقت کی قلت کا شکار ہو گیا ہے ۔ ستم گری تو یہ ہے کہ نفرت کرنے کے لئے بھی کوئی اپنے قیمتی لمحے ضائع کرنا نہیں چاہتا ۔ میں نے کافی ہاؤس میں دو ادیبوں کو دیکھا گھڑی دیکھ کر ایک دوسرے کو گالی گلوچ دے رہے تھے ۔ اچانک ایک ادیب اٹھ کھڑا ہوا ۔ بولا ۔

" سوری ! اب باقی نفرت پھر سہی ۔"

" ہرگز نہیں آج ہی سو فیصدی نفرت پوری کی جائے گی ۔"

" ارے میرا ہوائی جہاز نکل جائے گا ۔ باقی نفرت بمبئی سے واپسی پر کریں گے ۔"

" واپسی پر ؟ مگر میں وعدہ نہیں کر سکتا ۔ زندگی اتنی تیز رفتار ہے ، کون وعدہ وفائی کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ نجانے اس وقت تک مجھ میں بھی نفرت کی یہ شدت رہے نہ رہے ۔"

غرض آج کل وقت کی بے حد قلت ہے جس سے انسان ایک دوسرے کے لئے " بائی دی وے " سے ہو گئے ہیں ۔ رشتے مختصر ہو گئے ہیں ۔ بیوی ، شوہر ، ماں ، بہن ، باپ ، محبوبہ ، جیب کترے ، تھانیدار ، کوے اور بسکٹ ..... ہر رشتے کا چہرہ مسخ ۔ کہاں تو وہ رشتہ کہ کوے پیغام لائے ۔ گھی کی پوری پاتے اور کہاں یہ کہ پیغام نہ لائیں گے نہ دیں گے ۔ پیغام کا رشتہ غائب ۔ مگر بسکٹ پانے کا رشتہ قائم ۔ اور وہ بھی پا لیں گے نہیں چھینیں گے وجہ بڑی مدلل دیں گے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت ہی نہیں ہے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ رشتے قطعی ٹوٹ گئے ہیں ۔ نہیں ، رشتے ہیں ، مگر لمحوں

کے ڈوبتے ابھرتے سانسوں کے اندر یہ سانس لیتے ہوئے رشتے کیا ہیں۔
بلبلے ہیں کہ ادھر ابھرے، اُدھر ڈوبے، اُدھر ڈوبے ادھر ابھرے۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے ایک بہت بڑی فرم کے منیجنگ ڈائریکٹر کے والد صاحب انتقال کر گئے۔ بیٹے کو ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی۔ انھوں نے جنازہ برداروں سے باادب باملاحظہ گزارش کی کہ والد صاحب قبلہ کے انتقال پر افسوس ہوا۔ میں نے دفتر کی کرسی پر ایک آنسو بہا دیا ہے۔ اس سے زیادہ آنسو بہانے کے لئے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ لیکن یہ بتا دیجئے کہ جنازہ ٹھیک کتنے بج کر کتنے منٹ پر قبرستان میں پہنچ جائے گا۔ تاکہ میں ڈائریکٹ وہاں پہنچ جاؤں۔"

ایسوں کے باپوں کو انتقال کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ کہ وقت کونسا پینترا بدل رہا ہے۔ اور قبرستان تک پہنچتے پہنچتے کون سا پینترا بدلے گا .... وقت کی قلت ہوجائے تو رشتے مضمحل ہو جائیں۔ تو شور مچانے اور کائیں کائیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا تو لپکو، جھپٹو اور بھاگو اور یا پھر اُس اپاہج کوّے کی طرح مراقبے میں بیٹھے رہو۔

تین کانے

ایک آدمی اُس وقت تک کانا ہے جب تک اس کے ساتھ ایک
اور نہ ملایا جائے۔ جونہی ایک اور اس کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ ایک نہیں رہتا۔
گیارہ بن جاتا ہے۔ جب تک میں ایک تھا، مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا
جاتا تھا کہ نہ جانے یہ لفنگا ہے۔ آوارہ گرد ہے۔ پھر میرے ساتھ میری بیوی
جڑ گئی۔ اور میں گیارہ بن گیا۔ اب مجھے کوئی لفنگا نہیں کہتا تھا۔ بلکہ سماج
کا مہذب فرد کہا جانے لگا۔ مہذب بنتے ہی گاؤں کی سبھی کنواریاں محفوظ ہو گئیں۔
اگرچہ ایک کنواری بڑی اُداس ہو گئی۔ کیونکہ وہ مجھ پر مرتی تھی — نہ جانے کتنے
ہی میرے ایسے ایک "کانے" ہو جاتے ہیں۔ جو غلطیوں سے مل کر گیارہ
بن جاتے ہیں۔

کئی ممالک میں ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ ڈکٹیٹر صرف ایک ہوتا ہے۔ کسی

ملک میں دو ڈکٹیٹر ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ ایک ڈکٹیٹر دوسرے ایک ڈکٹیٹر سے مل کر گیارہ کبھی نہیں بن سکتا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک ڈکٹیٹر سے پوچھا "آپ اپنے ساتھ کسی اور کو کیوں نہیں ملاتے۔ تاکہ گیارہ بن جائیں۔ زیادہ طاقتور بن جائیں"

اُس نے جواب دیا "میرے ساتھ ایک اور جُڑا ہوا ہے۔ اور وہ میری قوم ہے۔ جو میرے سامنے احترام سے سر جھکاتی ہے۔"

مگر میں نے اُسے یہ نہیں کہا کہ ایک قوم ایک ڈکٹیٹر سے کبھی نہیں جڑتی ہے۔ احترام اس لئے کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک پستول سے ڈرتی ہے جو آپ کی جیب میں ہے — چنانچہ دو سال بعد قوم باغی ہو گئی۔ اور ڈکٹیٹر کا پستول گر گیا۔ اور قوم نے اُسی پستول سے ڈکٹیٹر کا قلعہ قمع کر دیا۔ ڈکٹیٹر جو ایک تھا، کانا ہو گیا۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ ایک قصبہ میں ایک مسجد تھی۔ پھر اُس قصبے میں اُتھل پتھل ہوئی، مسجد میں نماز پڑھنے والے آدھے آدمی بھاگ گئے۔ مسجد نہ بھاگ سکی۔ کیونکہ وہ ایک تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی جڑا ہوا نہیں تھا۔ پھر اُس قصبے میں کچھ سکھ آ گئے۔ انہوں نے وہاں ایک گردوارہ تعمیر کر لیا۔ مسجد بھی ایک تھی گوردوارہ بھی ایک تھا۔ مگر دونوں مل کر گیارہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ مذہبی تعصب کبھی گیارہ نہیں بننے دیتا۔ اپنی اپنی عبادت گاہوں کو کانا ہی رکھنا چاہتا ہے۔ اور پھر کچھ دیر بعد قصبے کے ہندوؤں نے سوچا کیوں نہ ہم بھی ایک مندر بنا لیں۔ چنانچہ پھر یوں ہوا کہ تین عبادت گاہیں الگ الگ بن کر کھڑی ہو گئیں۔ تین ایک الگ الگ ہو گئے نہ گیارہ بن سکے نہ ایک سو گیارہ۔

پھر ایک بار دوسرے ملک نے اس قصبے پر حملہ کیا۔ بمباری کی اور تینوں عبادت گاہیں مسمار ہو گئیں۔ تینوں میں اللہ موجود تھا۔ مگر وہ بھی کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ بھی ایک تھا۔ چنانچہ عبادت گاہیں تو تاریخ میں نام پا گئیں۔ اللہ نہیں پا سکا۔

دو ــــــ

میری کالونی میں ایک مدراسی بوڑھا ہے۔ وہ صبح کی سیر پہ نکلتا ہے۔ تو اپنے دوسرے ساتھی کو بھی ہمراہ لے جاتا ہے۔ ا دوسرے ساتھی کا نام "ٹنکو" ہے۔ اور ٹنکو ایک کتے کا نام ہے۔ دونوں جب ساتھ چلتے ہیں۔ تو دونوں ریٹائرڈ بوڑھے لگتے ہیں۔ مگر ایک جیو کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے جیو کو بھی اپنا دوست بنائے چاہے وہ بوڑھا ہو چاہے کتا ہو۔ مگر وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ مدراسی بوڑھے کی بیوی اس کے ساتھ اس لئے نہیں چلتی۔ کیونکہ وہ بھگوان کی پوجا کرنے چلی جاتی ہے۔ یعنی اس نے بھگوان کے ساتھ ناتہ جوڑ لیا ہے اور اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگی ہے۔

جب تک آپ اکیلے ہوتے ہیں۔ تو گویا گونگے ہیں۔ زبان رکھنے کے باوجود گونگے۔ لیکن جونہی کوئی دوسرا آدمی آپ کو دکھائی دے جاتا ہے۔ آپ اس سے بولنے لگتے ہیں۔ گونگا پن ختم ہو جاتا ہے۔ آپ دوسرے آدمی سے کہتے ہیں "آپ جانتے ہیں میں کون ہوں"

دوسرا کہتا ہے۔ "میری جانے جوتی"

"مگر میری جوتی تم سے زیادہ مضبوط ہے۔"

"بگڑی بات بنائے ۔ ہمت ہے تو ہو جائیں دو دو ہاتھ ۔"

ہاں، آدمی دو نہ ہوں تو فتنہ فساد نہیں ہو سکتا ۔ دنیا میں جتنے فسادات ہوئے ہیں ۔ دو آدمیوں کی برکت سے ہی ہوئے ہیں ۔ دونوں کی یہ برکتیں ہی ایک دوسرے کو فنا کر سکتی ہیں ۔ دو آدمی، دو مذہب، دو قومیں، دو ملک ۔ اگر دنیا بھر میں ایک ملک ہو، تو فیکٹریوں میں اسلحہ بنانا تو ضیع اوقات ہو جاتا ہے ۔ خدا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے دو انسان پیدا کئے ۔ ایک آدم، ایک حوّا ۔ پھر دونوں جنّت سے نکال دیئے گئے، کیونکہ اس کی رضا یہی تھی کہ اگر تم دونوں کو فتنے پیدا کرنے ہیں تو نیچے زمین پر جا کر کرو ۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے، خدا کی رضا پوری ہوئی، اور دو آدمیوں کی موجودگی کی بدولت کتنی تہذیبیں فنا ہوئیں ۔

لیکن دو آدمی آپس میں عشق بھی کرتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں اور اس لئے بن جاتے ہیں، کیونکہ ایک آدمی کہتا ہے "تمہیں خشک پھلوں میں کون سا پھل اچھا لگتا ہے ۔"

" بادام!"

" کمال ہے ۔ مجھے بادام ہی سب سے اچھا لگتا ہے ۔ اور حسینہ کی آنکھیں ؟"

" بادامی آنکھیں ؟"

" اور اب بادامی آنکھیں ہی میری کمزوری ہیں ۔ "

" تو پھر آؤ، ہم ایک دوسرے کو "چھپی" ڈالیں، ایک دوسرے کے دوست

مگر پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے قریبی دوست ہی ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بادام، بادامی آنکھیں، حسینہ، سبھی گم ہو جاتے ہیں۔ اور دو انسان ہی ایک دوسرے کی ایک ایک آنکھ پھوڑ ڈالتے ہیں۔
اور یہ دوتین کانے ہو جاتے ہیں۔

تین

ایک انسان اکیلا پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ جوان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی آدمی کو جوان بننے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ چنانچہ رکاوٹ نہ ہو تو وہ کسی حسین یا بھونڈی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی کے سال ڈیڑھ سال بعد اسے تہنیت کے تار ملتا ہے کہ ایک بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی پہلے ایک، پھر دو ہوئے، بچہ پیدا ہوتے ہی تین ہو گئے۔ اور اس طرح تین کے ہندسے نے دنیا میں سر ابھارا۔ کوئی خاندان اس وقت تک خاندان نہیں بنتا۔ جب تک وہاں تین افراد نہ ہوں۔ اور یہ تین ہی خاندان کو برباد کر دیتے ہیں۔ بچہ نالائق نکلا۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا کہ ہم نالائق کو ہی ہیرو بنا سکتے ہیں۔ بمبئی کی فلمی صنعت میں اکثر ہیرو ہی ہیں جنھیں والدین نے نالائق ڈیکلیر کر دیا تھا۔ جب وہ مقبول ہیرو بنے تو نہ صرف ماں باپ اس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے ہیں۔ بلکہ وہ انکل بھی اس کے ساتھ فوٹو کھنچوا لیتا ہے۔ جو ہمگلر ہے اور جانتا ہے۔ کہ ہیرو بھتیجے کا ماراج ملک کا ایک بہت بڑا وزیر ہے۔

دو آدمی ایک ہوٹل کی میز پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ دونوں خاموش

جتنی ایک ایسی باتیں وہ کر سکتے تھے۔ وہ ختم ہو چکی تھیں۔ اتنے میں ایک تیسرا شنا سا آدمی نمودار ہوا۔ ایک خاموش آدمی اچھل پڑا " وہ دیکھو، وہ پھنسا، یہ تیسرا آدمی۔ اسے بلاؤ۔ اسے ہم دونوں بے وقوف بنائیں گے۔ اور لطف اندوز ہوں گے۔"

دونوں آدمی تیسرے کے بغیر تھوڑا ہٹ گئے۔ چپ چاپ تیسرا آیا۔ ماحول میں جان پڑ گئی۔ قہقہے لگے۔ حرارت عزیزی تیز اور آدھے گھنٹے بعد میں نے دیکھا۔ اس تیسرے آدمی نے دونوں کو بیوقوف بنا ڈالا ــــ یعنی جاتے جاتے دونوں آدمیوں سے ایک ایسے دودھیا آشرم کے لئے پچیس پچیس روپے چندہ لے گیا۔ جہاں صرف ایک دودھوا مقیم تھی۔ اور وہ اس کی بیوی تھی۔

تین ــــ دوکا ایک لازمہ ہے۔ مگر وہ صرف خود کانا نہیں ہوتا دوسرں کو کانا کر جاتا ہے۔

ہندوستان کے سیاستداں

ہندوستان کے سیاست دانوں کو یقین ہے (یقین اور یقین کامل میں فرق ہوتا ہے) کہ جس طرح خدا شاعر کو صرف شاعری کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ہم سیاست دانوں کو بھی صرف سیاست کے لئے پیدا کرتا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اور کوئی کام آتا ہی نہیں۔ اگر کوئی کام آتا تو سیاست کیوں کرتے؟

مگر مجھے اس یقین میں مکاری تو نہیں البتہ خامی ضرور محسوس ہوتی ہے کیونکہ میں نے ایک شاعر کو دیکھا کہ وہ شاعری بھی کرتا تھا اور کلرکی بھی۔ شاعری دل کی آواز تھی، کلرکی پیٹ کی۔ چنانچہ میں نے ایک سیاستداں کی توجہ اس شاعر کی طرف مبذول کرائی۔ تو سیاست داں بڑی بے پروائی سے کہنے لگا " ایسے تو پھر میں بھی ڈسپوزل کے مال کا کاروبار کرتا ہوں "

میں نے کہا " تو گویا آپ صرف سیاست کے لیے پیدا نہیں کئے گئے۔"

" آپ سمجھے نہیں - یہ ڈسپوزل کا کاروبار بھی تو ایک طرح کی سیاست ہے۔"

چنانچہ ہمارے ہندستانی سیاستدان سیاہی کاروبار کریں یا کالا دھندی سیاست کریں اُن سب میں ایک مشترکہ خوبی یا خرابی (یا دونوں) یہ ہے۔ کہ وہ سوشلزم کا پرچار ضرور کرتے ہیں۔ کروڑوں کے مالک بن جائیں گے مگر سوشلزم کے لئے سُولی پر چڑھ جانے کا اعلان مسلسل کرتے رہیں گے۔ ایک ٹریجڈی ہے۔ کہ جوں جوں مال و متاع بڑھتا جائے گا۔ سُولی تھر تھر کانپ کر پیچھے ہٹتی جائے گی۔ سُولی کیوں پیچھے ہٹ جاتی ہے میں نے ایک سیاستداں سے پوچھا۔ تو اس کا واضح جواب تھا " کیونکہ سوشلزم میں میری قوتِ ارادی بڑی مستحکم ہے۔"

ایک اور سیاستدان کے متعلق مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس کی قوتِ ارادی بڑی مضبوط تھی۔ چنانچہ جس تین منزلہ بلڈنگ میں اس کی رہائش گاہ تھی۔ اس کی اُوپر لی منزل پر پارٹی کا جھنڈا لہراتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ہوا کے طوفانی جھکڑ سے جھنڈا ایک دھماکے کے ساتھ نیچے بازار میں گرا۔ تو سیدھا ایک راہ چلتی بڑھیا کے سر پر گرا۔ جسے نیم بیہوشی کے عالم میں ایک ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ ہسپتال کا خرچہ نیشنل میموریل فنڈ میں سے ادا کیا گیا۔ مگر اسی سوشلسٹ جھنڈے اور نیشنل میموریل فنڈ کے باوجود بڑھیا

جانبر نہ ہو سکی۔ لہٰذا لاش کے ساتھ گھبرائے ہوئے گلے والے سیاستدان نے ایک تصویر کھنچوائی — بڑھیا کو شہید قوم ڈیکلیر کر کے پارٹی دفتر میں اس کی تصویر لٹکا دی گئی جس کے نیچے تحریر تھا۔ ؎

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے

چنانچہ ایک دن وہاں پولیس میلہ لگانے پہنچ گئی۔ کیونکہ انہیں خفیہ رپورٹ ملی تھی کہ وہ سیاست دان اسی بلڈنگ کے تہہ خانے میں شراب کی بھٹی چلاتا تھا۔ حالانکہ سیاست داں پولیس افسروں کو قائل کرانا چاہتا تھا کہ میرے پاس خدمتِ قوم کے ثبوت میں یہ تانبے کا تمغہ بھی ملا ہوا ہے۔ لیکن پولیس نے قانون کے اندھے پن سے فائدہ اٹھایا اور شہید بڑھیا کی تصویر اور سیاستداں دونوں کو زیرِ حراست کر لیا۔ پارٹی آفس اور شراب کی بھٹی دونوں کو سیل بند کر دیا۔

لیکن ایک دن بعد میں نے دیکھا وہ سیاست داں کچلی منزل پر بیٹھا ہمیٹ، مچھلی اور چاول کا ایک ریسٹوران کھولے تبسم بر لب بیٹھا ہے۔ میں نے بھی تبسم سمیت پوچھا "جناب! کیا آپ پر کیس نہیں چلا۔ کیا آپ رہا ہو گئے۔ اور پارٹی کا جھنڈا کہاں ہے؟"

وہ بولے "میں برسرِ اقتدار پارٹی میں شامل ہو گیا ہوں"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے اس کی پالیسی پسند آگئی۔"

"مگر عمر بھر آپ اس کی پالیسی پر کڑی تنقید کرتے رہے۔ اور اب ....؟"

"ہی ہی ہی! یہ ایک طرح کی سیاست ہے ____ لیجئے، یہ ذرا راہو مچھلی کھائیے۔

غریب عوام کی بہبودی کی خاطر میں نے اتنی اعلیٰ کھیلی، جناب سستے دام پر بیچ رہا ہوں۔"

ہندستان کے سیاست دان اور سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر عوام کی بہبودی نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ عوام کی بہبودی کے لئے سب ایسے کام کرتے ہیں۔ کہ بعد میں انہیں اپنے اُن کاموں پر یقین نہیں آتا کہ یہ کام ہم سے سرزد ہوگئے۔ مثلاً میں نے ایک لیڈر کو بھکاری فقیروں کا چیتھڑا لباس پہن کر نیم عریاں ڈانس کرتے دیکھا۔ ایک اور مزدور لیڈر فیکٹری میں لنچ کے وقت پہنچ جاتا۔ اور میلے کچیلے فرش پر بیٹھ کر اُن کے ساتھ پیاز کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے کھانے کا تعلق اس بھاشن سے ہوتا۔ جو لنچ کے بعد وہ مزدوروں کے دماغوں میں انڈیل دیتا۔ جیسے وہ بھاشن نہ ہو ایک ستے ہو۔ اور بھرتے کرتے ہوئے زار و قطار رونے لگتا۔ میں نے دیکھا۔ اس کی جیب میں درجن بھر رومال ہوتے۔ جن سے وہ بھیگے ہوئے آنسو برابر پونچھے جاتا۔ ایک رومال پوری طرح بھیگ جاتا، تو دوسرا رومال نکال لیتا۔ تیسرا، چوتھا ـــــ درجن بھر رومالوں کا کوٹہ ختم ہوجاتا، تو لنچ ٹائم بھی ختم ہوجاتا۔ اور مزدور نعرے لگاتے۔

"انقلاب زندہ باد!" ـــــ "روٹی، روزی جو چھینے، وہ سرکار نکمی ہے۔"

"ہمارا لیڈر کون؟ چمپالال جی!" ـــــ "چمپالال جی! امر رہیں!"

اور پھر سیاست داں چمپالال جی، اپنی کار میں بیٹھ لوٹ جاتیں۔ وہ کار جو فیکٹری کے سرمایہ دار مالک نے، عوام کی طرف سے عوام کی خاطر، عوام کے فائدے کے لئے چمپالال جی کو دی تھی۔

گو گو گو گو بند!

شروع کے جتنے گو گو گو گو ہیں، یہ دراصل ان کا اصلی نام تھا۔ آخر میں صرف گو بند ان کا تخلص تھا۔ جیسے پٹیالہ کے ایک سابق مہاراجہ کی پانچ سو رانیاں تھیں تو مہاراجہ ان رانیوں کا تخلص تھا۔

مسٹر پانچ گو گو بند کی والدہ چوں کہ نیک خصلت تھیں اس لئے مسٹر گو بند بھی عمر بھر اپنے آپ کو نیک خصلت سمجھتے رہے۔ ان میں بس یہی واحد خوبی تھی کہ انھیں اپنی غلطی کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔

احباب کی محفل میں جب ہنستے تھے تو صرف اکیلے ہنستے تھے کیونکہ ہمیشہ بے معنی بات پر ہنستے تھے۔ احباب ان کا منہ دیکھتے جاتے اور یہ احباب کا منہ۔ یکھتے رہ جاتے کہ میری طرح ہنستے کیوں نہیں۔ ایک مرتبہ محفل کے خاتمے پر میرے کندھے پر دست محبت کا ہاتھ رکھ کر بولے "آپ ذرا رک

جائیے، آپ سے اہم گفتگو کرنا ہے۔"

محفل برخاست ہونے پر میں رُک گیا تو مسٹر گوبند بولے۔ "فکر صاحب!

اگر ـــ پولیس عوام پر لاٹھی چارج کرے اور پھر عوام میں سے صرف دو آدمیوں کو گرفتار کرے تو کیا اس میں مزاح کا پہلو نہیں نکلتا؟"

میں نے کہا "پہلو نکلتا تو ہے۔ دو آدمی تو بہت کم ہیں پولیس کو چاہیئے تھا کہ چالیس پچاس آدمی گرفتار کرتی؟"

میرے منہ میں بسکٹ کا آدھا ٹکڑا دے دیا آدھا خود کھالیا اور بولے۔ "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ میں نے کارل مارکس کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ پولیس صرف دو آدمیوں کو پکڑتی ہے۔"

میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پولیس کو کارل مارکس کی ساری کتابیں پڑھنا پڑیں گی تبھی گرفتاریوں کی تعداد میں اصلاح کرنے کا انہیں موقع ملے گا۔"

مسٹر گوبند اپنے آپ کو مارکسسٹ تھیوری کا متوالا کہتے تھے مگر کمیونسٹ پارٹی کا ممبر اس لئے نہیں بنتے تھے کہ ان دنوں اگر کچھ غنڈے ریل گاڑی کی پٹری اکھیڑ دیتے تو پولیس کمیونسٹوں کو گرفتار کرلیا کرتی تھی۔ مسٹر گوبند گرفتاری سے اتنے خوفزدہ نہیں تھے جتنی اپنی جائیداد کے حشر پر۔ کہتے تھے، "میں انقلاب کے لئے گرفتاری جب دوں گا جب اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ جائیداد کا فیصلہ کرلوں گا۔"

اور پھر ایک مرتبہ جب ان کی نیک خصلت والدہ انتقال کرگئیں تو فیملی میں

صرف وہی نیک خصلت انسان باقی رہ گئے اور جائداد جو مکان کے چار کمروں اور تین کرائے کی دکانوں پر مشتمل تھی اس کا فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ منجھلے بھائی کی زرخرید غنڈوں سے پٹائی کر کے اسے شہر سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ چھوٹا بھائی فلمی ہیرو راج کپور بننا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ بمبئی چلا گیا۔ تیسرا بھائی ٹرک ڈرائیور تھا۔ ناجائز شراب کا سپلائر بھی ـــــ اور ایک رات ناجائز شراب کے نشے میں اس نے لکھوا لیا کہ میرے پاس بھگوان کا دیا سب کچھ ہے مجھے اس مکان کی ایک اینٹ بھی نہیں چاہیے۔ ایک کنواری بہن تھی۔ شباب مقدار اس میں چونکہ قدرے زیادہ تھی۔ اس لئے گوبند نے پہلے اسے ایک عاشق ڈھونڈ دیا اور پھر بہن نے بھائی سے کہا "وہ اب مجھے اجازت دے دیں تو میں اس سے شادی کر لوں۔"

مسٹر گوبند نے کہا۔ "والدہ صاحبہ کا بھی یہی خیال تھا کہ تمہاری بہن خاندان کا منہ کالا کرے گی اور جھک مار کر خود ہی شادی کرے گی۔"

اس پر بہن کو آگ لگ گئی اور وہ عاشق کے ساتھ ایک قصبے میں بھاگ گئی۔ ایک مرتبہ میں نے گوبند سے پوچھا "کیا حال ہے تمہاری بہن کا۔ کیا اس نے شادی کر لی؟"

"ضرور کی ہوگی اس کنجری نے۔ ورنہ بچے کی ماں کیسے بن جاتی؟"

میں نے پوچھا "کارل مارکس نے ایسی شادیوں کے بارے میں کیا لکھا ہے۔"

وہ حقارت سے بولا "میں نے مارکسزم ترک کر دیا ہے۔ فضول سی تھیوری ہے۔ ہندوستان میں مارکسی انقلاب قیامت تک نہیں آ سکتا۔ مجھ سے لکھوا لو۔"

مسٹر گوگو گوبند نے مارکسی نظریہ اس وقت ترک کر دیا جب لوگ کہنے لگ گئے تھے کہ اگر مسٹر گوبند آج اپنا مکان بیچ دیں تو پندرہ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔ مگر انہوں نے مکان نہیں بیچا۔ کرایہ نے پر چڑھا دیا۔ چار ہزار روپے ماہانہ کرایہ جیب میں پڑجاتا۔ جس کارخانے میں کام کرتے تھے وہاں سے ایک ہزار روپیہ تنخواہ پاتے تھے چند برس بعد ایک ناجائز پلاٹ خرید لیا۔ بلکہ اس پر ایک ناجائز مکان بھی تعمیر کر لیا۔

اس کے باوجود جب بھی کبھی ملتے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہتے۔

" فکر صاحب! اس ملک میں ایکسپلائٹیشن عرف استحصال کی حد ہے گوبھی تک سات روپے کلو سے کم میں نہیں ملتی۔"

میں کہتا " سچ کہتے ہو مسٹر گوبند، جس ملک کے سرمایہ دار گوبھی تک نہیں کھا سکتے اس ملک میں انقلاب کبھی نہیں آ سکتا۔"

" اں، یہاں سچ مچ سرمایہ داروں کے شکنجے میں قوم گرفتار ہے۔"

میں نے کہا "تم بھی سرمایہ دار ہو گوگو گوبند! ہر سال غریب کرایہ داروں کا کرایہ بڑھا دیتے ہو۔"

" کیا کروں جی۔ گوبھی تو کسی نہ کسی طرح کھانا ہی ہے۔ آپ ذرا دیکھئے کہ میرا ابوٹ کتنا خستہ حال ہو چکا ہے۔"

یہ بوٹ مسٹر گووند نے اس وقت خریدا تھا جب ان کی والدہ زندہ تھیں۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا تم نے نیا بوٹ یا تو والدہ محترمہ کے غم میں نہیں خریدا۔ اور یا کارل مارکس کی کتابوں میں یہی لکھا ہوگا کہ عوام نیا بوٹ اس وقت تک نہ خریدیں جب تک انقلاب نہ آجائے۔

گذشتہ ہفتے مجھے مسٹر گوگی گی گووند ریلوے اسٹیشن پر مل گئے۔ بڑے حراساں اور پریشان خاطر تھے میرے پوچھنے پر بتایا۔

"دیکھئے فلاں صاحب! ریلوے ٹکٹیں تک بیباک میں خریدی ہیں۔ ایک سو روپوں کے ٹکٹوں کے ڈیڑھ سو روپے ادا کئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بیوی بچے سمیت۔"

"وشنو دیوی کی یاترا کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ نہیں جانتے۔ ایک خطرناک کیس مجھ پر بن گیا تھا۔ بھگوتی جاگرن کرایا تو کیس سے نجات ملی۔ اب وشنو دیوی جی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"کون سا خطرناک کیس تھا؟" میں نے یہ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا پوچھا کہ آپ کے کیس، جاگرن اور یاترا کے بارے میں کارل مارکس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ صرف ہنس پڑے۔ زندگی میں وہ پہلی بار ایک معنی خیز بات پر ہنسے۔

ناطہ جڑی چھکّے کا

میرا ننّھا سا معصوم پوتا کل جوش سے تالیاں بجاتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "بابا آج آپ کو ایک خاص بات بتاؤں۔ جسے سُن کر آپ حیران ہو جائیں گے۔"

"بتاؤ۔ لیکن اگر میں سُن کر بھی حیران نہ ہوا تو۔؟"

"تو آپ کی اور میری کٹی ـــــ" یوں لگا جیسے وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔

ہم دونوں کے تعلقات میں ناراضگی شامل ہو جائے تو میں اس کی ناراضگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے ہلکی سی گدگدی کر کے صلح کا جھنڈا بلند کر لیا۔ کیونکہ ہم دونوں کا ناطہ ہی بولوں کا ناطہ تھا۔ چنانچہ میں نے سرِ شکست خم کر کے عرض کیا "دیکھو پنٹو۔ میں اس شرط پر حیران ہوؤں گا۔

اگر تم اپنی کٹی واپس لے لو۔"

دل کا ناطہ تھا۔ اس لئے اس نے کٹی فوراً واپس لے لی۔ اور کہا۔" وہ جو ہمارے سکول کی میڈم نیلم جی ہیں نا؟ آج اسے بہت سے روپے مل گئے۔ اس لئے بہت خوش تھی اتنی خوش کہ اس نے میرے ہوم ورک کی کاپی بھی چیک نہیں کی۔

میں سمجھ گیا کہ اس میڈم کو تنخواہ ملی ہوگی۔ تنخواہ کا ناطہ خوشی سے اور ہوم ورک کی چیکنگ سے جو اس کا روزانہ کا ناطہ تھا تنخواہ کی خوشی نے وہ ناطہ توڑ دیا۔ سماج کے ہر انسان کے رشتے اسی طرح بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔
میں نے معصوم پوتے سے چونکہ وعدہ کیا تھا۔ اس لیے حیران ہو گیا اور کہا حیرت ہے بیٹا کہ اس نے تمہاری کاپی چیک نہیں کی۔ ورنہ اس میں جو غلطیاں ہوں گی اور انشاءاللہ ضرور ہوں گی۔ تو تم ...... میرا مطلب ہے کہ پٹائی سے بچ گئے اور یہ بات تمہارے لئے خوشی کی ہوگی۔ میرے لئے حیرانی کی کہ چند روپے اسے ملے تو وہ اپنی ڈیوٹی بھول گئی۔
برخوردار نے گردن اکڑا کر کہا:" میری غلطیاں! نہیں بابا! حیرت تو یہ ہے کہ آج میری ایک بھی غلطی نہیں تھی۔ لاؤں کاپی! خود دیکھ لیجئے۔ لیکن یہ بتائیے کہ اسے اتنے سارے روپے کہاں سے ملے۔"
میں نے کہا۔" اسے مہینے کی تنخواہ ملی ہوگی بیٹا!"
"اسے تنخواہ کیوں ملتی ہے بابا؟"
" وہ تمہاری کلاس کے بچوں کو ہر روز پڑھاتی ہے نا۔ اس لئے سکول

کے منتظمین اس کے بدلے میں تنخواہ کے روپے دیتے ہیں ۔"

وہ پوچھنے لگا۔" سکول والے یہ روپے کہاں سے لاتے ہیں ۔؟"

مجھے یوں لگا جیسے ننھا پوتا اپنی معلومات میں خواہ مخواہ اضافہ کرنا چاہتا ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس سے اس کی معصومیت چھن جائے گی ۔ معلومات انسان کے پاس جتنی کم ہوں اتنا ہی وہ کئی خطروں سے محفوظ رہتا ہے ، میں ایک دو منٹ خاموش رہا۔ لیکن وہ معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مصر رہا ۔ یوں لگتا تھا ، وہ خطروں کی طرف بڑھ رہا ہے ، ایک مرتبہ تو جی چاہا ، کہ اسے بتا دوں بڑے بڑے لیڈر جو الیکشن کے لئے لاکھوں روپے لاتے ہیں ۔ وہ بلیک مارکیٹروں سے لاتے ہیں کیونکہ لیڈر اور بلیک مارکیٹر کا ایک خاص ناطہ ہوتا ہے ۔ اور بیٹا ! یہ ناطوں کی دنیا ہے ۔

لیکن پھر سوچا یہ پولیٹکل سوداگری کا علم ننھے کی معصومیت کو چھید چھید کر دے گی ۔ اور پھر سکول کی پڑھائی مہینہ بھر ہو سکھاتی ہے ۔ جب جا کر اسے تنخواہ ملتی ہے ۔ اور یہ علم کی محنت ہے کہ بے علموں کی سوداگری نہیں ہے ۔ اس لئے میں نے جواب دیا ۔" بیٹا ! اسکول والے جو روپیہ حاصل کرتے ہیں اسے بچوں کے ماں باپ بطور فیس انہیں ادا کرتے ہیں ۔ جن میں سے تمہاری میڈم کو اپنی محنت کا پھل بطور تنخواہ ملتا ہے ۔"

ننھا معصوم قدرے مطمئن ہوا ۔ لیکن اضطراب اس کی آنکھوں میں مزید معلومات کے لئے تڑپتا رہا ۔ چنانچہ پوچھنے لگا ۔" تو پاپا ! میڈم

تنخواہ لے کر خوش کیوں ہوگئی ۔ وہ روپے لے کر کیا کرے گی ۔ کیا آئس کریم خرید کر کھائے گی ؟"

" ہاں، ہاں ۔ آئس کریم ، مکھن ۔ دودھ ۔ بچوں کے کپڑے مکان کا کرایہ سینکڑوں چیزیں ۔"

" کیا ان روپوں سے وہ سینکڑوں چیزیں خرید سکیگی ۔ ؟ آپ تو کہا کرتے تھے ، مہنگائی بہت ہے ۔ کوئی من پسند کی چیز تو لوگ خرید ہی نہیں سکتے ۔ تو وہ کیسے خریدے گی ؟"

" نہیں خریدے گی تو ٹھنڈی آہ بھرے گی ۔"

" کیا ٹھنڈی آہ کا تعلق بھی مہنگائی سے ہے ۔ ؟"

" بیٹا! اس دُنیا کی ہر چیز کا ایک دوسرے سے تعلق ہے ۔ مہنگائی کا تعلق کرپشن سے ہے ۔"

" کرپشن کیا ہوتی ہے بابا ؟"

اب میں معصوم پوتے کے سوالوں سے تنگ آگیا ۔ تنخواہ تو اس کی میڈم لے گئی اور سبق مجھے پڑھانا پڑ رہا ہے میں اسے کیسے بتاؤں کہ تمہاری میڈم مکان کا جو کرایہ دیتی ہے ۔ مالک اس کی رسید نہیں دیتا ۔ اور بغیر رسید کے جو کرایے کی رقم لیتا ہے ۔ اسے کالے دھن میں شامل کر لیتا ہے ۔ اقتصادی تہذیب اس حد تک گر چکی ہے کہ بیس بیس لاکھ روپے سے اسمبلی کے ممبر خریدے جا سکتے ہیں اور اس خرید و فروخت کو جمہوریت کہتے ہیں ۔ اور یہی جمہوریت ہمارے ملک میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتی ہے ۔

ادن ہوں، میں اپنے معصوم پوتے کی معلومات میں اس حد تک اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی معلومات بیک وقت وسیع اور ناقص ہو جائیں کیا میں یہ بتا کر اس کے معصوم ذہن کو غلیظ دلدل میں پھنسا دوں کہ وہ جس دکاندار سے سکول کی اشیاء خریدتی ہے۔ ان کی رقم میں سے ایک سو روپیہ اگر خود کھا جاتی ہے تو پچاس روپے دکاندار کی جیب میں بھی ڈال دیتی ہے۔ کیونکہ پرنسپل کا مالی ناطہ دکاندار سے ہے اور دکاندار کا ناطہ اس سیلز ٹیکس انسپکٹر سے ہے۔ جو دکاندار سے اپنا ماہانہ بھتہ چارج کرتا ہے۔"

"بتاؤ نا۔ بابا! ورنہ میری کٹی۔"

اور میں معصومیت سے کٹی کا تصور کر کے لرز جاتا ہوں۔ چنانچہ اس سے کہتا ہوں "سچ بولوں۔ یا جھوٹ؟"

"سچ ہی بولیے۔ کیونکہ میری کتاب میں یہی لکھا ہے کہ جھوٹ مت بولو۔ ورنہ پولیس پکڑ کر جیل میں لے جائے گی۔"

ارے بابا! کتاب کی بات چھوڑو۔ پولیس نے بھی اگرچہ وہ کتاب پڑھی ہوتی ہے۔ مگر سچے آدمی کی جیب میں چرس ڈال کر اسے گرفتار کر سکتی ہے۔ اس لئے تم ابھی کرپشن کا علم حاصل مت کرو۔ بڑے ہو جاؤ گے تو تم کرپشن کا شکار ہو جاؤ گے۔ یا خود کرپٹ ہو جاؤ گے۔"

اور اس کا جواب تھا کہ "میں بڑا ہو کر کرپٹ نہیں بنوں گا۔ آپ کی طرح شاعر بنوں گا۔" اور میرا جواب یہ تھا کہ شاعری میں بھی کرپشن کے

گولڈن چانس بن گئے ہیں۔ سابقہ اکیڈمی تک کرپشن کی مہربانی سے ایوارڈ دینے لگی ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اعلیٰ معلومات کو ابھی ناقص ہی رہنے دو۔ اور جاؤ جھڑی چھکا لے آؤ۔ ہم تم دونوں کھیلیں گے۔"

اور وہ اتنا خوش ہوا کہ بھاگ کر ایک منٹ میں چڑی چھکا لے آیا اور ہم دونوں پارک میں جا کر کھیلنے لگے۔

میں کی ایک اور کہانی

میں جس گھرانے میں پیدا ہوا۔ نہ اس کے اہل نہیں تھا کہ میں وہاں پیدا ہوتا۔ لیکن وہاں نہ پیدا ہوتا یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔ بلکہ ایک مجبوری تھی کیونکہ میرے باپ نے میری ماں سے شادی کر لی تھی۔ عجیب واہیات قانونِ قدرت ہے کہ جب ایک عورت اور مرد شادی کریں تو ایک بچہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

قانونِ قدرت اس سوچ سے عاری ہے کہ اس بچے کو اس گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے یا نہیں۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ بیچارے قانونِ قدرت کی بھی ایک مجبوری ہے۔ بچہ چاہے نہ چاہے مگر کوئی پراسرار طاقت خلافِ قانونِ قدرت کو محصور کر کے فرمان جاری کر دیتی ہے کہ اسی گھرانے میں فلاں بچے کو پیدا کر.....

پیدا تو میں ہو گیا ۔ مگر میری پیدائش پر شادیانے بجانے کا چانس اس لئے نہیں تھا کہ مجھ سے پہلے میرے والد صاحب تین بچوں کو جنم دے چکے تھے ۔ شادیانے کا اہل صرف پہلا بچہ ہوتا ہے ۔

میرے والد صاحب اتنے شریف اور سلیم الطبع انسان تھے کہ میری ان سے کبھی بنتی ہی نہیں تھی ۔ اگر وہ میرے لئے ایک جوتا کالے رنگ کا خرید لاتے تو میں ناک بھوں چڑھا لیتا ۔ اور اسے پہننے سے صاف انکار کر دیتا ۔ کہتا میں تو صرف سرخ رنگ کا جوتا پہنوں گا ۔ کالے رنگ سے مجھے کوئی خاص کد نہیں تھا ۔ کد صرف اس بات پر ہوتا تھا کہ والد صاحب کو کیا حق ہے کہ میرے لئے کسی بھی رنگ کا انتخاب کریں ۔۔۔ میرے متعلق گھر کا کوئی بھی آدمی فیصلہ کرتا، میں اس کی مخالفت شروع کر دیتا ۔

والد صاحب مجھے سمجھایا کرتے " دیکھو! بیٹے کو ہمیشہ سعادت مند ہونا چاہیئے "

اور میں ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیتا " میں سعادت مند بنوں گا تو اپنی مرضی سے ۔ آپ کون ہیں حکم دینے والے "

" میں تمہارا باپ ہوں "

" آپ میری مرضی سے باپ تھوڑے بنے ہیں ۔ مساعد یا نامساعد حالات کا شکار ہیں کہ والدین بن گئے ہیں ۔"

غرض میں گھرانے کے ہر فرد کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا ۔ میری رضا ہوتی تو کسی کی بات مان لیتا اور مانتا بھی یوں کہ بات کہنے والا انتظار

آ ہیں بھرتا۔ اور اگر رضا نہ ہوتی تو میں کسی کی بات کو دو کوڑی کی اہمیت بھی نہ دیتا ـــــ اگر میں سکول کی تعلیم میں طلباء ذہین نہ ہوتا اور استاد حضرات میرے گھرانے پر میری طرازِ دانش مندی کا یہ بوجھ نہ لاد دیتے تو گھر والے مجھے جوتیاں ہی چٹخاتے چٹخاتے گھر سے باہر نکال دیتے۔

اور میں گھر سے نکل کر بڑی طمانیت محسوس کرتا۔ گویا میری سوچ اور میرا عمل دونوں مثبت نہیں منفی اقدار کے نمائندہ تھے۔ پورے گھرانے میں میرا وجود نفی ہی نفی تھا۔ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا، مار پیٹ، بے نیازی میرے اندر کی میں، کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی۔ برداشت مجھے صرف اس لئے کیا جاتا کہ ہر سال کلاس میں میری پوزیشن سب سے اول آتی۔ اگر چہ ایک بار اوّل آنے پر ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری پیٹھ پر آفرین کی تھپکی دی تو اکڑ فوراً میرے منہ سے نکل گیا " جناب! میں آپ کی برکت سے اوّل نہیں آیا۔ برکت میری اپنی تھی۔ براہِ کرم میری برکت کا کریڈٹ خود مت لیجیے۔"

ہیڈ ماسٹر مسکرا دیا۔ مگر اندر سے جل بھن گیا ہوگا۔ اگر چہ وہ شاعر تھا لیکن کیا شاعر جل بھن نہیں جاتے جب کسی دوسرے شاعر کی غزل پر داد تحسین کے ڈونگرے برس رہے ہوں۔

کبھی کبھی میرے والد صاحب تعجب اور پریشانی کے ملے جلے لہجے میں میری ماں سے کہا کرتے، "سمجھ میں نہیں آتا ایسا منفی بیٹا ہمارے خاندان میں سے کس پر گیا ہے؟"

وہ جواب دیتی، "کم از کم مجھ پر نہیں گیا۔"

ماں بالکل غلط بیانی سے جواب دیتی یا نا سمجھی کے سبب! حالانکہ میں نے بعد میں تجزیہ کیا تو یوں لگا کہ میرے نوے فی صدی خصائل میں میری محترمہ ماں گھلی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ بھی سرتاپا منفی مزاج کی مالک تھی۔ والد صاحب اس سے شدید نالاں تھے مگر اپنا کرب کسی پر ظاہر نہ کرتے۔ بیوی کو زہر سمجھ کر اندر ہی اندر پی جاتے۔ شاید شاستروں کی اس تھیوری کے بُری طرح قائل تھے کہ ناری جاتی کا احترام کرنا چاہیئے۔ چاہے وہ آپ کی ہڈیاں چبا رہی ہو۔ میری ماں ہر کام اپنی رضا سے کرتی۔

باپ مانتا تھا، کہتا نہیں تھا کہ یہ بیٹا اپنی ماں پر ہی گیا ہے۔

میں اس وقت پینتالیس سال کے پیٹے میں ہوں۔

احباب کی محفل جمی ہے۔ اچانک کوئی صاحب اندر آجائیں تو میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ نووارد کو کرسی کی پیش کش کرتا ہوں "آئیے یہاں تشریف لائیے" میرے اس ایکشن پر بنہ میں اعتراض کرتا ہوں انہوں نے میری کرسی۔

ایک پڑوسی کا ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تو میں مضطرب ہوا تھا اسے ٹیکسی میں ہسپتال لے گیا، ڈاکٹروں کے پیچھے پڑ گیا کہ میرے پڑوسی کو پلستر کر دیجئے، ورنہ میرا ہارٹ دھک دھک کر رہا ہے۔ رات بھر مریض کے سرہانے بیٹھا رہا، اس کے ہاتھ پاؤں ملتا رہا۔ تھک ٹوٹ کر چور ہو گیا۔ لیکن ایک عجیب سا حیوانہ تسکین اور مسرت مجھے حاصل ہوتی رہی۔

میری بیوی نے کہا یہ رات بھر کی تھکن آپ کے اعصاب پر ضرور اثر

ڈالے گی۔ بھلا آپ کو کیا ضرورت تھی اتنا بیش قیمت وقت برباد کرنے کی۔ کیا اس پڑوسی کے رشتہ دار مر گئے تھے۔

اور میں نے جواب دیا، "پگلی! انسانیت اور اخلاق سے کسی کی خدمت کی جائے تو اسے بڑا سرور ملتا ہے، دوسرے کو جتنا سرور دے سکتے ہو دے دو۔"

غرض چند برسوں سے میرے یہ اطوار ہو چکے ہیں کہ کسی کا بھی کوئی کام ہو، اپنے انتہائی ضروری کام کو تلانجلی دے کر سرانجام دیتا ہوں۔ کسی کو نوکری چاہیئے۔ تھانیدار کو سفارش کرنی ہے، پسماندہ لوگوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے تو ایک ہفتہ جیل بھی جا چکا ہوں۔

میری یہ خصلتیں دیکھتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں "اجی آپ کیا جانیں، خاندانی آدمی ہے، بالکل اپنے والد صاحب پر گیا ہے۔ جو نہایت شریف الطبع اور نیکی اور بھلائی کا مجسمہ تھے۔"

اور میں نے جب اپنے طور طریقے کے یہ پہلو دیکھے تو دور بہت پیچھے اپنے ماضی پر نگاہ ڈالی کہ میرے باطن میں جو ایک منفی "میں" تھا۔ وہ کہاں گیا؟ کیا دفن ہو گیا، کیا وہ میرے اندر کسی گوشے میں دب کر آخری سانس لے رہا ہے اور اب جو میرے اندر ایک صالح نمود و نمائش سے عاری ایک "میں" جاگ اٹھا ہے۔ کیا یہ بھی میرے اندر موجود تھا۔ میں تو کبھی اپنی رضا کے خلاف کوئی بات دیکھ کر بھڑک اٹھتا تھا۔ وہ بھڑک تڑک کہاں گئی۔

کیا میرے اندر دو "میں" ایک ٹھنڈا نیم اور دوسرا تیکھا اور گرم۔
کیا پہلا "میں" اپنا رول ختم کر کے چھپ گیا یا چلا گیا۔ اور میری ہر حرکت کو
اس ٹھنڈے اور نرم "میں" کو سونپ گیا۔ کہ اب تم اس کے اندر سانس لو۔
اور میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ زندگی کے کس واقعہ نے میرے اندر
آہستہ آہستہ اس تغیر کو پروان چڑھایا۔
اور نہ ہی میں یہ فیصلہ کر سکتا ہوں کہ میں اپنے والد پر گیا تھا یا
والدہ پر۔

میں نے پوچھا!

• میں نے ایک رنگین مزاج بوڑھے سے پوچھا "قبلہ آپ کو اپنے انتقال پر سب سے زیادہ افسوس کس بات کا ہوگا؟
وہ بولے "یہی کہ آہ! شہر میں جتنی رنگین مزاج عورتیں ہیں میرے بغیر بیوہ دکھائی دیں گی۔

• میں نے ایک شوہر سے پوچھا۔ "بھائی جان! تمہارے اور تمہاری بیوی کے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟"
اس نے جواب دیا۔ "وہ مجھے صرف اس لئے برداشت کر رہی ہے کیونکہ میں اسے برداشت کر رہا ہوں۔"

• میں نے ایک بھائی سے اس کے دوسرے بھائی کے متعلق پوچھا۔ کہ اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟

وہ کہنے لگا۔ خونی رشتہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ خون اتنا بھونڈا اور بدنما ہوتا ہے۔

• میں نے ایک شاعر سے پوچھا۔ تم عمر بھر سرمایہ دار کے خلاف شاعری کرتے رہے ہو۔ مگر اب جبکہ تم خود سرمایہ دار بن گئے ہو تو تم اب کیسی شاعری کرتے ہو؟

"میں نے اب شاعری چھوڑ دی ہے۔"

• میں نے خداوند تعالیٰ سے پوچھا۔ آج فلاں آدمی تمہارے خلاف نہایت ہرزہ سرائی کر رہا تھا۔ تم اسے اس ہرزہ سرائی کی سزا کب دو گے؟

خدا نے جواب دیا۔ "سزا نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آج صبح جب وہ میری عبادت کرنے آیا تھا۔ تو مجھ سے میرے خلاف بولنے کی اجازت لے گیا تھا۔

• میں نے ایک بھونڈی شکل کے گداگر سے پوچھا۔ تم جو لڑھی میں اس گھناؤنے زخموں والے بڈھے کو لے کر گھوم رہے ہو اور اس کے نام پر خیرات مانگ رہے ہو۔ اس بڈھے سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟

اس نے جواب دیا۔ "ففٹی ففٹی کا۔"

• میں نے عوام سے پوچھا۔ کل تم نے جلسہ گاہ میں لیڈر پر گندے انڈے کیوں پھینکے؟"

کیونکہ وہ ہمارے کھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔"

• میں نے ایک اخبار کے بلیک میلر مالک سے پوچھا۔ آپ نے کل رات شہر کے عظیم الشان ہوٹل میں ایک پرتکلف ڈنر دیا تھا۔ تو اس میں وہ لیڈر کیوں شامل ہوا جس کے متعلق آپ نے اخبار میں لکھا تھا کہ ایک کال گرل کے ساتھ اس کے تعلقات مشکوک ہیں۔

• تعلقات مشکوک ہوتے تو وہ لیڈر ......

تو وہ لیڈر ......

اس ڈنر کی پوری ادائیگی نہ کر دیتا۔

• میں نے ایک ادبی میگزین کے ایڈیٹر سے پوچھا تم نے فلاں شاعرہ کی فوٹو چھاپ دی۔ اس کیا تھا اس کی نظم کیوں نہیں چھاپی؟

وہ بولا۔ "ہم اپنے میگزین میں صرف معیاری چیزیں چھاپتے ہیں۔"

• میں نے ایک وکیل سے پوچھا۔ تم نے فلاں مقدمے میں قانون کی جتنی من گھڑت تشریحیں کیں جج نے ان سب کو مسترد کیوں کر دیا؟

وکیل نے جواب دیا۔ کیونکہ وہ جج کبھی خود بھی وکالت کرتا تھا۔

• میں نے ایک اپٹوڈیٹ حسینہ سے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے آپ کو شاعری بہت پسند ہے؟"

بولی۔ "شاعری نہیں، مجھے تو پوئٹری پسند ہے۔"

• میں نے ایک بوڑھی مالدار بیوہ سے پوچھا "آپ اتنے بڑے مکان میں جس کے آٹھ دس کمرے ہیں۔ اکیلی کیوں رہتی ہیں؟"

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "کیا کروں۔ کوئی شریف اور معقول کرایہ دار ہی نہیں ملتا۔"

"آپ کے تین لڑکے تھے، وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"وہ الگ الگ مکان کرایہ پر لے کر رہتے ہیں۔"

• میں نے ایک آدمی سے پوچھا "تم نے اس عورت سے شادی کیوں کی جو پہلے ہی دس مرتبہ بیوہ ہو چکی ہے؟"

وہ بولا "اسے گیارہویں مرتبہ بیوہ کرنے کے لیے۔"

• میں نے ایک رشوت خور افسر سے پوچھا "آپ نے فلاں صاحب سے ایک ہزار روپیہ رشوت لی تو اس کا کام کیوں نہیں کیا؟"

"کیونکہ سبھی نوٹ جعلی نکلے۔"

• ایک سٹوڈنٹ نے اپنے لیکچرار سے پوچھا "آپ نے ابھی فرمایا کہ یہ کائنات اتنی چھوٹی ہے کہ ہم اسے اپنے احاطے میں لے سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے خدا پر کوئی اثر نہیں پڑے گا؟"

لیکچرار نے جواب دیا "یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا خدا کس سائز اور قد و قامت کا ہے۔"

• میں نے ایک کتے سے پوچھا "ہڈی تمہارے منہ میں تھی۔ دوسرا کتا وہ ہڈی چھیننے کے لیے تمہارے پیچھے بھاگا۔ مگر تم نے ہڈی نہیں چھوڑی۔ لیکن جب وہ کتا تھک کر بیٹھ گیا اور

بیٹھ گیا ۔ تو تم نے ہڈی اس کی طرف پھینک دی ۔ تم نے ایسا کیوں کیا ؟"

وہ بولا " وہ مجھ سے طاقت کے زور پر ہڈی لینا چاہتا تھا ۔ مگر میں اس پر احسان کرنا چاہتا تھا ۔"

● میں نے فکر تونسوی سے پوچھا ۔" کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنی بیوی کی آڑ لے کر اچھا ادب پیدا کرتے ہیں ؟"

فکر تونسوی نے جواب دیا ۔" مگر میری بیوی اس کے بالکل اُلٹ کہتی ہے ۔"

میں نے اپنا ایک دوست بنایا۔ مگر میں دروغ بیانی کر رہا ہوں۔ اُس نے مجھے اپنا دوست بنایا۔ ورنہ میں تو کسی ایسے ویسے کو دوست بنانا ایک اذیت سمجھتا ہوں۔ سڑک پر چلتے چلتے آپ کسی راستے کے کانٹے سے کبھی نہیں کہتے "تنہا ہوں۔ دالان! آؤ اور میرے پاؤں میں چبھ جاؤ۔"

نہیں، کانٹا خود آپ کے پاؤں میں چبھ جاتا ہے۔ آپ کا دوست بن جاتا ہے۔

میں جس دوست کا ذکر کر رہا ہوں اس کا اسم شریف شبن لال تھا۔ یہ عجیب المیہ ہے کہ تین چار سال کی ملاقاتوں میں جب رشتے کا تسلسل نہیں ٹوٹ سکا تو میں اُسے سچ مچ اپنا دوست سمجھنے لگا۔ دوستی میں ایسا

المیہ بڑا ضروری ہوتا ہے۔ ہم دو دوست صرف اس لیے بنتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی "میں" ایک دوسرے کے حلق میں انڈیلتے رہیں۔ ——— انڈیلتے رہنے کے اس عمل کو دوستی کا مرتبہ مل جاتا ہے ——— "میں" کی بے بسی کی بھی حد ہے۔

میں نے اس کے اندر جو کچھ انڈیلا۔ اُس کے اندر جا کر کتنا مرا اور کتنا زندہ رہا، میں نہیں جانتا۔ کیونکہ شبن لال ہو یا فکر تونسوی۔ دونوں گہرے سمندر ہیں، اناپھیرڈں کے وسیع سمندر ——— مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب بھی میرے ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں سے کوئی جھانکتا۔ میں سمجھ جاتا کہ یہ شبن لال ہے۔ میں نے کئی بار اُس سے کہا۔ "شبن لال میرے گھر کے باہر کال بیل لگی ہوئی ہے، وہ کیوں نہیں بجاتے۔"

وہ مسکرا کر کہتا۔ اور اُس کی مسکراہٹ یوں لگتی، جیسے اُس کے لبوں پر عذاب بن کر آ ٹھہری ہو۔ "فکر صاحب! کال بیل بجانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اُس کی آواز میں شرافت نہیں ہوتی۔ جھانکنا مجھے شریفانہ عمل لگتا ہے۔"

میں ہنس دیتا۔ "مگر جھانکتے تو صرف ہم سب چور ہیں اور یا پھر کوئی حسین کنواری جھانکتی ہے۔ جو عقل نہیں، صرف عشق کو راہِ نجات سمجھتی ہے۔" شبن لال صرف عقل و دانش کا پتلا ہے۔ اُس کا خیال ہے دوسرے بھی اُسے دانشمند تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً میرے دفتر کے سبھی لوگ!

میں کہتا ہوں۔ "تو پھر دفتر کے سبھی لوگ اُلّو ہوں گے۔"

"نہیں، نہیں۔ دفتر کے علاوہ بھی مُلک کے بہت سے لوگ میری عقل کا لوہا مانتے ہیں۔"

"وہ لوگ کبھی آتو ہوں گے؟"

"ہی ہی ہی!"

میں سوچتا ہوں۔ اور قدرے فخر کی گردن بلند کر لیتا ہوں۔ کہ میری "مَیں" نے شبن لال کو شکست فاش دے دی۔ چاہے اپنے مذاق کی عادت کی آڑ لے کر — اگرچہ کبھی کبھی شرمندگی کی لہر مجھے لمحہ لمحہ لگاتی ہے۔ کہ تمہیں صرف اپنے ایک لمحے کی فتح کے لیے شبن لال کی تضحیک نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خاموشی سے اُس کی بات سُن لیتے۔ تو وہ تمہیں عظیم سمجھ لیتا۔

یہ صحیح ہے کہ خاموشی میں عظمت ہوتی ہے۔ مگر عادت پھر بھی عادت ہے۔ مستقل عمل آتے ہی چھوٹتی نہیں۔ آدمی نے اگر اپنی عادت کو مار دیا۔ تو سمجھو اپنے آپ کو مار دیا۔

لیکن شبن لال کی بھی ایک عادت ہے۔ جس پر میں اپنی عادت کا جارحانہ حملہ نہیں کرتا بلکہ خاموشی سے اس کی اس عادت کا تفریحی لطف اُٹھاتا رہتا ہوں۔ مثلاً اگر میں کہوں "شبن لال جی! آج کل دُنیا زر وسیم کے پیچھے چیونٹیوں کی طرح آدم دبو! آدم دبو! کرتی پھرتی ہے۔"

تو وہ بے اختیار پھڑک اُٹھتا ہے۔ "واہ، واہ، واہ! آپ نے تو میرے دل کی بات چھین لی۔ گزشتہ ہفتہ میں نے ایک انگریزی روزنامہ میں

ڈاکٹر اقبال اور سوامی رام تیرتھ کے تقابلی مطالعہ پر ایک مضمون لکھا اور اُس کے آخری فقرے کی قیامت دیکھیے کہ "ڈاکٹر اقبال کو ڈھونڈھنا چاہو تو سوامی رام تیرتھ کے ہاں ملیں گے۔ اور سوامی رام تیرتھ کی تلاش چاہیے تو ڈاکٹر اقبال کے گھر کا رُخ کیجئے۔ فکر صاحب! اب تک قارئین نے اسی مضمون پر پندرہ تعریفی خطوط بھیج چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔" ابھی پندرہ خط اور آپ کے دروازے پر دستک دیں گے۔ لیکن کشن لال جی! اسٹیم وزر کا اقبال اور رام تیرتھ سے کیا تعلق ہے؟"

وہ بولے۔" آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے اپنے دس کمروں والے مکان میں ایک اور کمرے کا اضافہ کیا ہے۔ کمرہ بنواتے وقت میں نے آرکیٹیکٹ کو ایک جمالیاتی قسم کا زریں آئیڈیا دیا۔ کہ میرے اُس کمرے کا تعلق باقی دس کمروں سے یوں پیدا کرو کہ سبھی کمرے گیارہ اشعار کی ایک غزل معلوم ہوں۔ تعلق تو جناب! چاند کا تاروں سے، تاروں کا سورج سے، سورج کا اس کائنات سے ہوتا ہے۔"

اب مجھے خطرہ ہوا کہ وہ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ میں نے کائنات کی تجلیوں پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ آئن سٹائن نے تو نہیں لکھا۔ مگر یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے تحریر فرمایا جو آئن سٹائن کو اپنا طفلِ مکتب سمجھتا ہے۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کہا۔
" میں آپ سے سو فی صدی متفق ہوں۔ لیکن میرے ذہن میں ایک الجھن

ہے۔ کہ ہم جو لباس پہنتے اُس میں کیسے طے کر لیتے کہ پتلون میرے جسم کو زیادہ زینت بخش سکتی ہے۔ دھوتی کے پیر۔ اور دھوتی پوش اس کے برعکس سوچتا ہے۔"

وہ بولے ۔" جہالت ہے اور کیا ہے۔ مجھے دیکھئے" کل ایک وزیر سے ملنے گیا تو کوٹ پتلون کے ساتھ پگڑی باندھ لی۔ صبح کی سیر پہ جاتا ہوں تو نیکر پہن لیتا ہوں۔ لیکن لباس کوئی سا بھی زیب تن کرلوں۔ ڈاکیہ میرے ہاں ڈھیر کی ڈھیر ڈاک دے جاتا ہے۔ لباس کی وجہ سے ڈاک کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا ۔" اپنا اپنا نصیب ہے۔"

وہ کہنے لگے ۔" میں ابھی ابھی بدھ فلاسفی کی ایک کتاب پڑھ رہا ہوں، جو رشی کیش کے ایک سوامی نے اپنے الفاظ میں تحریر کی ہے۔ سوامی جی جب بھی اس شہر میں تشریف لاتے ہیں۔ میرے غریب خانہ ہی قیام فرماتے ہیں۔ میرے خیالات ان کے فلسفیانہ دماغ کی جیسے روشنی بنتے ہیں کتاب کے ساتھ سوامی جی کا ایک تازہ خط بھی آپ کو بھجوا دوں گا۔ جو انھوں نے میری فہم و ذہانت کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔"

میں پھر خاموش ہو جاتا ہوں۔ گونگا تھر۔ کیونکہ گونگا تھر شیتل لال کو زیادہ تفریح کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا۔ ڈرتا ہے کہ کہیں یہ تھر تڑخ نہ جائے۔ شیتل لال تو بولتا تھر ہے۔ آپ اس کی بات چھیڑیں یا انیت کی، وہ دنیا کی ہر چیز کا رشتہ اپنی "میں" کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ مجھے یہ بے معنی بڑا مضحکہ خیز

لگتا ہے۔ شبن لال کو نہیں لگتا۔ کیونکہ اس کا کامپلیکس یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے میں میری ذات ہی متحرک ہے۔ اُسی ہی میں حرارت ہے اور ہر مرحلے پر مجھے اپنی ذات کا اظہار کرنا ہے ــــ سُننے والوں کے متعلق اُسے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ بور ہو رہا ہے یا تفریح فرما رہا ہے۔ مجھے اُس پر رحم نہیں آتا۔ کیونکہ رحم کروں گا تو میری تفریح کا پورا نصف حصّہ کٹ جائے گا۔ اور وہ بھی دنیا بھر میں پروپیگنڈہ کرتا ہوا پھرے گا۔ کہ فکر تونسوی بڑا عیار انسان ہے۔ اُس سے گفتگو کر کے کوئی اپنی شخصیت کے ہیرے کو مٹی میں مت ملائیے۔

آپ دہلی کی کسی بھی سڑک پر چلتے جائیے، جانے جاتے کہیں نہ کہیں آپ کو سڑک کے راستے پر رکھے ہوئے خالی ڈرموں کی چوڑی قطار ضرور نظر آئے گی اور ڈرموں کے بیچ میں سرخ رنگ سے لکھا ہوا بورڈ کھڑا دکھائی دے گا۔

"سڑک مرمت کے لئے بند ہے خبردار!"

مگر مرمت کرنے کے لئے وہاں کوئی آدمی موجود نہیں ہوگا آپ تحقیق کریں گے مرمت کرنے والے آدمی کہاں چلے گئے۔

"وہ ہڑتال پر چلے گئے۔"

یعنی دہلی میں سڑک کی تعریف یہ ہے کہ وہ یا تو مرمت کے لئے بند ہوگی اور یا مرمت کرنے والے ہڑتال پر گئے ہوں گے۔ سڑک کی ایک

تیسری پہچان بھی ہے ۔ کہ اگر آپ چلتے چلتے اچانک کسی گڑھے میں گر پڑے ہیں۔ تو آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دہلی کی سڑک ہوگی جس سڑک پر کو لگاتار بارھویں یا رھویں قدم پر ٹوٹا پھوٹا نہ ہو اُسے آپ دہلی کی سڑک نہیں کہہ سکتے ۔

مگر ایک مرتبہ میں انڈیا گیٹ سے تلک برج کی طرف جانے والی سڑک پر پیدل جارہا تھا ۔ پیدل اس لئے کہ بس اسٹاپ پر آنے والی بس کی رضا ہے کہ آپ کو چڑھنے دے یا نہیں ۔ بس کی رضا اور اللہ کی رضا میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ۔ اور پھر یوں بھی مجھے ڈاکٹر نے ایک مہینہ پہلے مشورہ دیا تھا کہ سڑک پر پیدل چلا کرو ۔ آپ کی صحت کے لئے مفید رہے گا ۔ دورانِ خون چالو اور بس کی زحمت سے نجات ۔

ڈاکٹر جب کوئی مشورہ دے ۔ تو اُس پر ایک مہینہ بعد عمل کرنا چاہیئے ۔ ایک مہینے کے بعد کیوں ؟ یہ ایک راز ہے ۔ جو بتا دینا چاہیئے کہ ڈاکٹر میرا دوست ہے ، نہیں نہیں بیٹا ۔

بہرکیف میں سڑک پر چل رہا تھا تو غور سے دیکھ کر اچنبھا ہوا ۔ کہ سڑک یوں شفاف چمک رہی ہے جیسے کسی نوجوان حسینہ نے آنکھوں میں کاجل کی دھار سے قیامت ڈھا رکھی ہو ۔ میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا ۔

" جناب ! مگر پرسوں شام کو تو یہ سڑک مرمت کے لئے بند تھی اور سڑک پر اسٹرائیک پر گئے ہوئے تھے ۔ وہ ڈرم اور بورڈ کہاں گئے اور اسٹرائیک کا کیا حشر ہوا ؟ "

"ڈرم اور بورڈ راتوں رات ہٹا دیئے گئے اور سرکار نے مزدوروں کے تمام جائز اور ناجائز مطالبے منظور کر لئے۔ اس لئے چند گھنٹے میں پوری سڑک مرمت سے چکا چوند کر دی گئی۔"

میں نے کہا۔ "کوئی ایمرجنسی بات ہوگئی ہوگی۔"

"جی ہاں، کیونکہ آج ایک غیر ملکی وی۔آئی۔پی کی کار نے اس سڑک پر سے گزرنا تھا۔

دو سبق آموز نتیجے:۔

۱۔ مزدوروں کو صرف اس وقت سٹرائیک کرنی چاہیئے۔ جب باہر سے کوئی وی آئی پی آیا ہوا ہو۔

۲۔ وی آئی۔پی کو صرف اس سڑک پر سے گزرنا چاہیئے۔ جس پر یہ بورڈ لکھا ہوا ہو۔ "سڑک مرمت کے لئے بند ہے۔"

ہم دہلی کے شہری تو اس بات کے خوگر ہو گئے ہیں کہ دہلی کی ہر دوسری تیسری سڑک کہیں نہ کہیں ضرور کھودی جا رہی ہوگی جیسے ہم اخبار میں یہ خبر پڑھنے کے خوگر ہو گئے ہیں کہ کل دو تین مہلاؤں پر مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دیا گیا۔ یا ایک ٹرک اور سکوٹر میں ٹکر ہو گئی۔ ٹرک اور سکوٹر بچ گئے اُن کے ڈرائیور مر گئے اور فلاں بینک میں ڈاکہ ڈالا گیا۔ شبہ ہے کہ ڈاکوؤں میں ایک وزیر زادہ بھی شامل ہے۔ اس لئے پولیس کیس ایف آئی آر سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

جیسے کوئی سڑک مرمت کے لئے شروع توکر دی جائے۔ مگر ایف آئی آر مت آگے نہ بڑھ سکے۔

میں نے ایسی ایک ایف آئی آر کی حد پار نہ کر سکنے والی سڑک دیکھی جو ان علاقوں کی طرف جا رہی تھی جہاں افلاس کے مارے لوگ ڈیموکریسی کی چکی میں پس رہے تھے۔ تین ماہ سے اس سڑک پر ڈرم اور بورڈ موجود تھے مرمت غائب تھی۔

صرف بورڈ اور ڈرم کو ایف آئی آر کہا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا ۔" صاحب! مرمت نہ ہونے کی وجہ؟ (وجہ اصلی ہونی چاہیئے۔)

جواب دیا گیا۔" ادھر کسی وی آئی پی کے آنے کا چانس نہیں ہے۔"

" مگر لیڈر لوگ تو ان علاقوں میں پد یاترا کے لئے جا سکتے ہیں۔"

" وہ صرف الیکشنوں کے دنوں میں پد یاترا کرتے ہیں اور الیکشن کے اعلان میں شاید ابھی دو تین سال لگ جائیں۔"

" لیکن جناب! تو پھر اس سڑک کی مرمت آخر کب ہوگی؟"

" الیکشن سے ایک ہفتہ پہلے ضرور ہو جائے گی۔"

لیکن ایک دوسرے دانائے راز قسم کے آدمی نے بتایا کہ اصلی وجہ یہ نہیں ہے۔ کچھ اور ہے۔"

" کچھ اور کونسی؟"

" سڑک کی مرمت کے لئے جو روڑی اور تارکول وغیرہ سامان آیا تھا،

سرکاری انجینئر نے اسے پاس نہیں کیا۔ لہٰذا مرمت رُک گئی۔"

"پاس کیوں نہیں کیا؟"

"پاس ہو جائے گا۔ سُنا ہے۔ انجینئر اور ٹھیکیدار میں معاملے کی نہ بلکہ رفیقانہ گفتگو چل رہی ہے۔ جلد ہی کچھ سکے خاموشی سے کھنکھنائیں گے اور روڑی میٹریل کو اعلیٰ کوالٹی کا مرتبہ مل جائے گا۔ اور پھر سڑک کی مرمت سے ان مفلسوں کے بھاگیہ کھُل جائیں گے جو سکّے کھنکھنانے سے کھیلتے ہیں یا پیدا یاترا سے۔"

ایک تو دہلی کی سڑکیں لمبی بہت ہوتی ہیں جن پر چلتے چلتے خواہ مخواہ احساس ہوتا ہے کہ ہم تھک گئے ہیں۔ لیکن اگر سڑک پر جلدی جلدی گلی موڑ آجائے تو نفسیاتی طور پر تسلی ہوتی ہے کہ اب منزلِ مقصود اتنی دور نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک سڑک جو دو سال پہلے چار کلومیٹر لمبی تھی۔ تیسرے سال چھ کلومیٹر لمبی کر دی گئی۔ چوتھے سال آٹھ اور پانچویں سال گیارہ کلومیٹر — زندگی کے سال کم ہوتے جاتے ہیں۔ کلومیٹر کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ زندگی کلومیٹر کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ خبردار ہوشیار!

لیکن ایک اور سڑک میں نے دیکھی جو کافی چوڑی تھی مگر اب اسے مزید چوڑا کیا جا رہا تھا۔ ایک افسر سے میں نے پوچھا "یہ مزید چوڑائی کا خیال پانچ سال بعد کیوں آیا؟"

"دہلی سرکار کو پانچ سال پہلے معلوم ہی نہیں تھا کہ کاروں اور اسکوٹروں

کی تعداد پانچ گنا بڑھ جائے گی۔"

"میں نے کہا۔ "مگر پانچ سال بعد یہ تعداد دس گنا بھی ہو سکتی ہے۔ تب آپ کیا کریں گے؟"

"سڑک کو پھر چوڑا کریں گے۔"

لیکن ایک سڑک مجھے سب سے زیادہ خوش قسمت لگی۔ کہ جب وہ پوری طرح تیار ہو گئی۔ وزیر نے افتتاح بھی کر دیا مگر افتتاح کے دوسرے دن سڑک کو پھر کھودنا شروع کر دیا گیا۔ میں نے حیرت سے ایک انجنیئر سے پوچھا۔

"اجی آپ پھر اسے کیوں کھود رہے ہیں؟"

"ارے جی، سڑک بنانے کے بعد یاد آیا کہ ہم نے اس میں سیوَر تو ڈالا ہی نہیں۔ لہٰذا......؟؟؟"

ایک شاعر کی سمسیا

ایک شاعر ــــ ؟ شاعر فکر تونسوی کو ہی لے لیجئے۔ یہ صاحب آج سے چالیس سال پہلے شاعر تھے۔ مگر شاعری کرتے تھے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی اپنی سمجھ میں آنا بھی بند ہو گئی۔ شاعر کو جب کوئی سامنے نہ ملے، اُس سے داد نہ ملے۔ حتیٰ کہ کوئی ہوٹ کرنے والا بھی نہ ملے تو..... ؟ چنانچہ فکر تونسوی نے بھی شاعری ترک کردی اور شادی کرلی شادی لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ اس لئے فکر تونسوی زندہ رہا تو اس کی شاعری سورگ سدھار گئی۔

شاعر جب کوئی شعر لکھ لیتا ہے تو کسی نہ کسی کو سُنانا چاہتا ہے۔ جیسے کوئی آدمی لیڈر بن جائے تو اپنے چمچوں سے کہتا ہے " ارے کوئی سٹیج بناؤ، جلسہ کراؤ۔ سامعین لاؤ۔ میں اُن کے سامنے تقریر کرنا چاہتا ہوں "

تقریریں چاہے اس پر گندے انڈے پھینکے جائیں مگر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ گندے انڈے سامعین نے اس لئے پھینکے، کیونکہ وہ انہیں خود نہیں کھا سکتے تھے۔ چنانچہ وہ قوم کی بہبودی کی خاطر تقریر جاری رکھتا ہے گندے انڈوں کے ساتھ اُسے داد کی تالیاں بھی ملتی ہیں کیونکہ داد کی تالیاں بجانے والے کرائے پر عام مل جاتے ہیں۔ پیسے کی تہذیب میں ایسی کرایہ داری ایک الگ پیشہ بن گئی ہے۔

آج کل کے شاعر کی سب سے بڑی ٹریجڈی سامع ہے۔ کوئی بھی شاعر اگر کہہ دے "عرض کیا ہے" تو سامع بھاگ جاتا ہے کہ یہ سالا اپنی غزل سنائے گا۔ سامع شریف اور بزدل نکلا۔ تو شاعر پانچ چھ غزلیں اس کے حلق میں انڈیل دیتا ہے۔ حالات سچ مچ بڑی دردناک ہے کہ شاعر بہت ہیں، سامع نہیں ملتا۔ ایک شاعر نے تو مجھے یہاں تک بتایا کہ سامع مجھے ہفتہ بھر کی تلاش کے بعد ملا۔ مگر وہ سنگترہ چوس رہا تھا۔ بولا، جب میں یہ ایک درجن سنگترے چوس لوں گا۔ جب آپ کی غزل سنوں گا۔ سنگترے کی ایک پھانک شعر سے زیادہ رسیلی ہے۔

جب سنگترے ختم ہو گئے تو سامع نے ایک درجن سنگترے اور منگوا لئے۔ شاعر نے پوچھا۔

"کیا یہ دوسری درجن سنگترے بھی آپ ہی کھائیں گے؟"

سامع بولا۔ "نہیں، یہ آپ کھائیں گے۔ آپ جب تک سنگترے کھائیے، میں ذرا الیکٹریشن کے ہاں سے ہو کر ابھی لوٹتا ہوں۔"

اور شاعر کا بیان ہے کہ وہ پھر کبھی نہیں لوٹا یشکل سے ایک سامع ملا تھا ۔ ہاتھ سے نکل گیا ۔ میں نے شاعر سے اظہار تاسف کیا ۔ اور کہا " تو کیا میں بھی آپ کے لئے ایک درجن سنگترے منگواؤں ؟"

" کیوں ؟"

" کیونکہ لگتا ہے ۔ آپ دپی غزل مجھے سنانا چاہتے ہیں ۔"

وہ بولا " اجی آپ تو خود کبھی اعلیٰ شاعری کرتے تھے ۔ آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں "

میں نے عرض کیا " اجی شرمندہ تو میں ہوں گا ۔ کیونکہ سنگترے بہت مہنگے ہیں ۔ میں منگوا نہیں سکوں گا ۔"

یہاں سنگترے کھانے والے مل جاتے ہیں ۔ سامع نہیں ملتا ۔ الیکٹریشن کے پاس چلا جاتا ہے ۔

سنا ہے ایک مرتبہ غالب کو بھی سامع کی ضرورت پیدا ہوئی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیڑھ بجے انہوں نے ایک مصرع تخلیق کیا ۔ سنانے کے لئے مضطرب ہو گئے ۔ محلے میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے ۔ اُن کا دروازہ جا کھٹکھٹایا ۔ بیچارا مولوی آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا ۔ غالب نے کہا " قبلہ ! ابھی ابھی ایک مصرع تخلیق ہوا ہے ۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے ۔ عرض کیا ہے کہ

غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

مولوی نے دروازہ بند کرتے ہوئے داد دی ۔ اور کہا " ہاں مرزا صاحب آج کل روزگار کا برا ہی حال ہے ۔"

لیکن ایسا بھی نہیں کہ آج کل کرایہ دار سامع نہیں ملتے۔ گزشتہ دنوں میں کناٹ پلیس سے گزر رہا تھا۔ کیا دیکھا کہ ایک شاعر صاحب (کم از کم وہ اپنے آپ کو شاعر کہتے تھے) بڑی تیز قدمی سے جا رہے تھے میں نے (زبردستی ہی سمجھئے) اُن کا راستہ روک لیا۔ پوچھا "قبلہ! اتنی تیزی سے تو کوئی جنت کی طرف بھی نہیں جاتا۔ آپ کا ارادہ کیا ہے"

بولے جنت ہی سمجھئے، جن پتھ ہوٹل میں جا رہا ہوں۔ دس منٹ لیٹ ہو گیا۔"

"وہاں کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے کیا؟"

مشاعرہ ہی سمجھئے۔ وہاں بمبئی سے آئے ہوئے ایک زبردست شاعر قیام فرما ہیں۔ کروڑ پتی بزنس مین ہیں۔ وہاں وہ وہسکی، مرغا، کباب اور وغیرہ وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اور پھر اپنی نظمیں ہمیں سُناتے ہیں۔

"گویا آپ سامع کے طور پر جا رہے ہیں۔"

"اجی وہسکی اور کباب ہوں تو سامع بننا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا وہ اکثر وہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔"

"سال میں پانچ چھ بار تو آ ہی جاتے ہیں۔"

گویا پانچ چھ بار وہ سامع کی تلاش میں دہلی آ جاتے ہیں سامع تلاش کرنے کے لئے آج کل شاعروں کو کروڑ پتی بزنس مین ضرور بننا چاہیئے ۔۔۔ اس اعتبار سے آپ کی سامع نہیں مل سکتا۔"

"نہیں نہیں، نادر موقع پا کر وہاں میں بھی ایک آدھ شعر سنا دوں گا۔"

دوسرے دن اُس سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا "جناب کل رات سے آپ کو ایک آدھ شعر سنانے کا موقع مل گیا ؟"

" اجی کہاں ؟ سالے اُس کروڑپتی شاعر نے اپنی دس بارہ نظمیں سنائیں تو آدھے شاعر تو نشہ میں اپنے ہوش و حواس کھو چکے تھے ۔ اور آدھے آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھے ۔ کہ ہم بھی اپنی بے نظیر شاعری سنائیں گے ۔ چنانچہ غل غپاڑے سے فائدہ اٹھا کر اُس کروڑپتی نے مشاعرہ برخاست کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اور تین چار شکسیوں میں تمام شاعروں کو بھر کر کھسکا دیا ۔"

" شاعر مت کہیئے انہیں ۔ کرایہ دار سامعین کہیئے ۔"

وہ بولے "اچھا اب آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں ۔"

میں نے کہا "سیمنٹ کی نئی پالیسی پر پڑھنے جا رہا ہوں ۔"

شاعر کہنے لگا "سیمنٹ ؟ سنیئے سیمنٹ پر میں نے کل ایک نفیس شعر لکھا ہے کہ ؎

سیمنٹ ہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس نے بات اُس نے شکایت ضرور کی ۔

اور میں نے سوچا آخر اس نے اپنی تمنا حل کر ہی لی ۔ اور مجھے سیمنٹ کی آڑ میں سامع بنا ہی لیا ۔

فیملی پلاننگ پر ایک تقریر

صاحب صدر! (کیا آپ کے پانچ بچے ہیں) مجھے آپ کو پہچاننے میں قدرے غلطی سی ہو رہی تھی۔ مگر میں نے اپنی غلطی یوں درست کر لی ہے کہ آپ کے سامنے والی میز پر جو پھولوں کا ہار رکھا تھا، وہ آپ کی ہی گردن میں پہنایا گیا تھا۔ اور پھر آپ نے گردن سے اتار کر میز پر دھر دیا۔ ہر محفل کے صدر کا یہی وطیرہ بن گیا ہے کہ جو ہار اُس کی گردن کی زینت بنایا جاتا ہے، وہ اُسے اُتار کر میز کی زینت بنا دیتا ہے ۔۔۔ لہٰذا میز ہر صدر کی پہچان بن گئی ہے۔

حالانکہ گردن اور میز کے مرتبہ میں کافی فرق ہے، حیرت ہے کہ جو آدمی اس فرق کو بھی نہیں جانتا، اُسے ہی صدر کے لیے کیوں موزوں سمجھا جاتا ہے۔

اور صاحب صدر کے بعد محترم حاضرین! مجھے اس بات پر کچھ خاص مسرت نہیں ہوئی کہ اس میٹنگ میں صرف دانشوروں کو ہی مدعو کیا گیا ہے۔ اور نہ اس امر میں کوئی کمال نظر آیا کہ آپ دانشوروں کو سرکار کی طرف سے مدعو کیا گیا ہے۔ سرکار کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ کوئی بھی منصوبہ بنائے، کوئی سیمینار کرے یا کوئی میٹنگ بلائے، اُسے کاغذی فائل سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ کیونکہ سرکار ذمہ داری کا سارا بوجھ افسران پر ڈال دیتی ہے اور افسر سارا بوجھ کاغذوں پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ اور کس پر ڈالیں۔ بچارے سرکاری نوکر ہیں۔ یہی کاغذ انھیں تنخواہ دلاتے ہیں۔ عوام تو انھیں تنخواہ دیتے نہیں۔ اور پھر عوام ان کے ہاتھ آتے بھی نہیں، جن کے لیے یہ فیملی پلاننگ کی جا رہی ہے۔ ان کے ہاتھ تو یہی کاغذ آتے ہیں۔ جن پر وہ یہ رپورٹ لکھ کر سرکار کے سپرد کر دیتے ہیں کہ "فلاں تاریخ کو پانچ سے سات بجے تک ہم نے ملک کے سربرآوردہ دانشوروں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی۔ انھوں نے فیملی پلاننگ پر جو تجاویز پیش کیں یا ان کی خاطر تواضع کے لیے جو اخراجات کیے گئے وہ منسلکہ کاغذوں پر ثبت ہیں ــــ جے جوان! جے کسان!"

برادرانِ کرام! آپ نے اس میٹنگ میں جو تقریریں کیں، وہ خوبصورت اور مرصع الفاظ سے مزین تھیں۔ کیونکہ آپ لفظوں کے جادوگر ہیں مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جادوگری آپ کا پیشہ ہے۔ جذبات کا پیشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور چونکہ ان تقریروں میں ایک دہرائے ہوئے۔ لطیفے

کی سی کیفیت تھی۔ اس لئے بہت سے دانشوروں نے انہیں سُننا اپنی ہیٹی سمجھا۔
چنانچہ ایک دو دانشوروں کو میں نے دیکھا کہ وہ تقریروں کے دوران اونگھ
رہے تھے۔ صرف ان کا کمال یہ تھا کہ کسی نقرے پر داد کی تھاپ دی جاتی،
تو وہ بھی اونگھتے اونگھتے ہی داد کی تھاپ دے دیتے۔ اور پھر اونگھنے
میں مصروف ہو جاتے۔

مثلاً ایک دانشور نے تقریر میں کہا "حضرات (اونگھنے نہ اونگھنے
والے دونوں) میں اُس بھیانک لمحے کے انتظار میں جینا نہیں چاہتا جب
ہمارے ملک کی آبادی اتنی تیز رفتاری سے بڑھ جائے گی کہ ہماری نصف
آبادی فاقہ کشی کر رہی ہوگی اور نصف آبادی نیم فاقہ کشی۔"

تو اس نقرے پر کسی نے بلند آواز سے کہا "مکرر! مکرر!"
حالانکہ اس "مکرر" کہنے والے صاحب نے دو منٹ بعد مجھے سرگوشی
میں کہا "مقرر صاحب کا یہ خیال چرایا ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "چوری؟ مگر کس کی؟"
"میری! کیونکہ میں نے یہی خیال اپنی تقریر میں بھی پیش کیا تھا۔ یہ اور بات
ہے کہ الفاظ کا اختلاف تھے۔"

"تو پھر آپ نے "مکرر" کیوں کہا؟"
"اپنے خیال کی تائید مزید کے طور پر۔"

ہاں حضرات! ہم نے آج جتنی تجاویز پیش کیں۔ وہ سبھی پرانی اور آزمودہ
تھیں۔ تقریریں صرف تائید مزید کے طور پر کی گئیں۔ کل ہمارے محلے میں ایک

سبزی فروش کے ہاں چھٹی لڑکی نے جنم لیا۔ میں سمجھتا ہوں، وہ لڑکی نہیں تھی، ایک تائید تھی۔ ایک لڑکی کے بعد دوسری، اور دوسری کے بعد تیسری، چوتھی، پانچویں اور اب یہ چھٹی ــــ لڑکی کے بعد لڑکی، تائید کے بعد تائید اور وہ یوں تائید در تائید کئے جا رہے تھے۔

میں نے اُس سبزی فروش سے پوچھا۔ "تمہاری آمدنی کتنی ہے؟"

وہ بولا "اجی، ساٹھ ستر روپے روزانہ تو کما ہی لاتا ہوں۔ بھگوان کی دیا ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ چھٹی لڑکی کیوں؟"

"بھگوان کی دین۔"

"ارے چھ دینیں تو ہو چکیں۔ اب مزید تائید تو بند کردو۔"

"اجی صاحب! ایک بیٹا پیدا ہو جائے تو تائید مزید بند کردوں گا۔ کیونکہ سوچتا ہوں اگر لڑکا پیدا نہ ہوا تو میرا خاندان آگے کیسے چلے گا؟"

دانشور صاحبان! شاید آپ ہی سے ایک دانشور نے ایسی ہی ایک تجویز پیش کی تھی۔ کہ سرکار ایک قانون پاس کردے کہ آئندہ ہمارے خاندان لڑکیوں کے بل بوتے پر ہی آگے چلیں گے۔ مگر یہ جاہلانہ تجویز تھی۔ کیونکہ ہمارا سماج لڑکوں کے ہی سہارے کھڑا ہے لڑکیاں تو پرایا دھن سمجھی جاتی ہیں۔ وہ تو صرف اس لئے پیدا ہو جاتی ہے تاکہ کوئی لڑکا اپنے آپ کو لڑکی سے برتر سمجھ کر شادی کے وقت اس سے بے پناہ جہیز طلب کر سکے۔ ورنہ وہ ماں باپ کے گھر کنواری بیٹھی رہے اور والدین کے سینے کو مسلسل زخموں سے

ٹیسوں کا مخزن بناتی رہے۔ اگر والدین کچھ طبع نازک رکھتے ہوں تو وہ کنواری بیٹیوں کے غم میں خودکشی بھی کر سکتے ہیں ــــ بیٹیوں کو خاندان کا سربراہ بنانے والے ہماری روایات سے خاصے کورے ہیں۔ دانشوری تو وہ صرف کتابوں سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں۔ کتابوں میں اس گھاسی رام کا ذکر کبھی نہیں آیا جو ایک راج مستری ہے۔ پچیس روپے روزانہ پاتا ہے مگر اس کی چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں جبکہ اس نے خالص دودھ حاصل کرنے کے لئے ایک بکری بھی رکھ چھوڑی ہے اور وہ اسے اپنی ساتویں اولاد سمجھتا ہے۔

آج شام وہ ایک درخت سے سبز پتے توڑ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ "گھاسی رام آؤ، تمہیں فیملی پلاننگ کی میٹنگ میں لے چلوں۔ تمہارے لئے بڑی مفید رہے گی۔"

وہ بولا "نہیں صاحب! میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ دن بھر مزدوری کر کے ہاتھ پاؤں تھک کر ٹوٹ چکے ہیں۔ ابھی مجھے یہ سبز پتے توڑنا ہیں۔ پھر گھر چلا جاؤں گا۔"

"یہ سبز پتے کیا کرو گے۔؟"

"اجی، وہ میری ایک بکری ہے نا؟ اس کے پیٹ کے ایندھن کے لئے۔ اُسے بھی تو آخر جینا ہے۔"

"کیا اس بکری کو فیملی پلاننگ کا ٹیکہ لگوایا ہے۔"

"اجی رام رام کرو۔ وہ گابھن ہو گی تو بچہ پیدا کرے گی۔

بڑی ہو کر بکری بن جائے گی۔ دودھ دے گی۔ اگر اُسے ٹیکہ لگواؤں تو گھر میں چائے کے لئے دُودھ کہاں سے لاؤں گا۔ بازار میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ چار روپے کا دُودھ۔ رام رام۔ رام۔"

حضرات! آپ فیملی پلاننگ پر تقریریں بے شک کرتے رہیے، لیکن سماج تو نہیں سُنتا۔ وہ تو اس بکری کی سُنتا ہے۔ جو اس کے خاندان کو چائے کے لیے دودھ مہیّا کرتی ہے۔ اور خاندان چلانے والی سربراہ بنی ہوئی ہے۔

ووٹر!

دس برس پہلے ہم نے اسی قلم سے لکھا تھا کہ ــــ ووٹر ایک آنسو ہے۔ جسے الیکشن کے وقت موتی سمجھ کر مٹی سے چن لیا جاتا ہے اور الیکشن کے بعد اُسے پھر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔

دیکھ رہا ہوں دس برس بعد بھی ووٹر نے اپنا کردار نہیں بدلا۔ وہ بڑی با اصول شے ہے۔ دنیا چاہے لاکھ بدل جائے، لیکن با اصول لوگ اپنا اصول نہیں بدلتے۔ کل ایک صاحب کو چھت پر کھڑے دیکھا۔ وہ چاند کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔
"آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔؟"

وہ بولا "چندرماں کی پوجا کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "مگر چاند کے متعلق تازہ ترین تحقیق تو یہ ہے کہ

چنانہیں تیتھر، کھائیوں اور گڑھوں کے سوا کچھ نہیں۔ تو پھر یہ پوجا؟"
" ہاں، میں کھائیوں اور گڑھوں کی پوجا کر رہا ہوں۔
" چنانچہ کا کینڈر تو بدل گیا، مگر آپ نے پوجا نہیں بدلی۔ وجہ کیا ہے؟"
" کیونکہ میں بااصول آدمی ہوں۔"
جھک مار کر مجھے اُس بااصول شخص کی تعریف کرنا پڑی، بلکہ اُس کی تعریف مکرّر بھی کی۔ کیونکہ اُس نے بتایا کہ وہ گزشتہ کئی برس سے دیئے کو ووٹ دیتا چلا آ رہا ہے اور ندا بھی نہیں تھکتا۔ میں نے اُس سے کہا "مگر دیا تو جن سنگھ کا نشان تھا، مگر اب جن سنگھ نے اپنا نام بدل کر جنتا پارٹی رکھ دیا ہے۔"
وہ بولا "اجی جن سنگھ چاہے بدل جائے، جنتا پارٹی بن جائے یا جنتا پارٹی جہنم میں جائے، مگر میں تو دیئے پر ہی مہر لگاتا ہوں۔ کیونکہ میرا اصول ہے کہ پران جائے پر وچن نہ جائی۔"
میں نے اُس سے اس ڈر کے مارے یہ نہیں پوچھا کہ کیا تم ووٹ دینے سے پہلے سوچتے نہیں۔ تو کہیں یہ کہہ کر مجھے اُلّو نہ بنا دے کہ اجی سوچنا ووٹر کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ اور یہی میرا اصول ہے۔

گزشتہ دنوں ملک کی چار اسمبلیوں میں الیکشن ہو گئے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اوسطاً پچاس فی صد ووٹروں نے ووٹ دیئے اور باقی پچاس فی صد نے نہیں دیئے۔ وہ گھر میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے۔

یا انھیں اپنی دردناک داڑھ نکلوانی تھی۔ اس لئے پولنگ بوتھ کی بجائے ڈینٹل سرجن کے کلینک میں پہنچ گئے۔

میں نے گوڑگاواں کے ایک ڈینٹل سرجن سے پوچھا: "کیا آپ بھی لیکٹورول ووٹر ووٹ ڈالا ہے؟"

وہ بولا "نہیں تکرسا صاحب! اُس دن میرے ہاں مریض کچھ زیادہ آ گئے تھے جو دانتوں کے درد سے چیخ چلا رہے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ووٹ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ مریضوں کا چیخنا چلّانا دُور کیا جائے۔ تاکہ انہیں کچھ سکون ملے۔"

میں نے اُنہیں کہا "آپ لیڈر کبھی نہیں بن سکتے۔"

حیرت سے بولے "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ ہے کہ لیڈر وہی بن سکتا ہے جو ووٹروں کے چیخنے چلّانے کی پرواہ نہ کرے۔ انھیں سکون دینے کو اپنے قیمتی وقت کی بربادی سمجھے۔ مگر آپ تو چیخ چلاہٹ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ لیڈر کیسے بن سکتے ہیں؟"

بہرکیف تازہ الیکشن میں چونکہ پچاس فیصدی ووٹروں نے ووٹ دیئے۔ اس لئے ہم بلاتردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں سو فیصد ڈیمو کریٹک نظام چل رہا ہے۔ سو فیصدی اس لیے کہ پچاس ووٹر گھر سے باہر نکل آئے۔ اور پچاس گھر میں بیٹھے رہے۔ اور پچاس اور پچاس مل کر سو ہوتے ہیں۔ ریاضی کا سیدھا سا سوال۔

صرف ایک حالت میں صورتِ حال ذرا پیچیدہ ہو جائے گی کہ الیکشن

ہو رہا ہو اور ووٹر کو کچھ نہ ہو رہا ہو۔ ووٹ کی پرچی موجود ہو اور ووٹر موجود نہ ہو تو اس وقت سب سے پہلی دُرگھٹنا یہ ہوگی کہ چیف الیکشن کمشنر استعفیٰ دے دے گا اور ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی قطار میں جا کر کھڑا ہو جائیگا۔ کہ مجھے کوئی اور نوکری دو۔ کیونکہ ووٹروں نے تو مجھے نوکری سے نکال دیا ہے۔

اور دوسری دُرگھٹنا یہ ہوگی کہ لیڈر لوگ اتفاقِ رائے سے اپنی اپنی پارٹی کے تمام پرانے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر بیان شائع کر دیں گے کہ ووٹروں کو اس جرم کی سخت سزا دی جائے اور اُن پر ڈکٹیٹر شپ لاگو کر دی جائے۔

کوئی پوچھے گا "ڈکٹیٹر تو ایک ہوتا ہے۔ مگر آپ باقی لیڈر لوگ کیا کریں گے۔ کیونکہ آپ کو لیڈری کے سوائے اور کوئی کام آتا ہی نہیں"

تو لیڈر جواب دیں گے "ہم مجلسِ شوریٰ کے ممبر بن جائیں گے۔ کیا جنرل ضیاء الحق نے ایسا ہی نہیں کیا ہے؟

مگر مجھے خدشہ ہے کہ جب تک ہندوستان میں ایک بھی ووٹر موجود ہے ضیاء الحق کا یہاں کوئی چانس نہیں۔ کیونکہ ہم نے اپنے ہاں ہر الیکشن میں دیکھا ہے کہ اخباروں میں ووٹروں کی قطار بستہ تصویریں چھاپی جاتی ہیں۔ خاص طور پر زنانہ ووٹروں کی تصویریں تو بڑی نمایاں کر کے چھاپی جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباری فوٹوگرافروں کے ان عورتوں سے کیا تعلقات ہیں۔ بلکہ میں نے تو ایک ایسی تصویر دیکھی جس میں ایک نہایت حسین و جوان زنانہ ووٹر کیمرے کی طرف منہ کیے مسکرا رہی تھی۔ کیونکہ شاید اس نے حُسن زدہ ووٹ دیا۔

کہ جب کیمرہ فوٹو لے رہا ہو تو آپ کہیں "سمائل پلیز" ضرور کرنا چاہیے۔

اخباری فوٹوگرافروں کی بات چل نکلی ہے تو آپ کو کافی ہاؤس کا ایک واقعہ سناؤں کہ وہاں میری قریبی میز پر چار یا پانچ فوٹوگرافر بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ایک نے اپنی خودی کو بلند کیا، اور کہا۔ "دیکھا گذرا میرے اخبار میں جس بوڑھے ووٹر کی فوٹو چھپی ہے۔ اس کی عمر ایک سو پانچ سال ہے اور اس بوڑھے کو اس خاکسار نے ہی تلاش کیا تھا۔"

دوسرا کہنے لگا "ہوش! میرے اخبار میں وہ بڑھیا عورت دیکھی؟ جسے چار آدمی کندھوں پر اٹھا کر پولنگ بوتھ کی طرف لے جا رہے تھے۔ جانتے ہو اس کی عمر کیا تھی؟ ایک سو دس سال۔"

تیسرا فوٹوگرافر دونوں پر کھلکھلایا اور بولا۔ "اور جناب والا! میرے اخبار والے بوڑھے کی عمر ایک سو پندرہ سال تھی۔ میں نے جان توڑ محنت کی۔ پہلے اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ پھر کچھ مزدور اور بینچ گئے۔ جو اُسے گھر سے بوتھ تک لے گئے۔ وہ دمے کا مریض تھا۔ میں راستے بھر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ چار یا پانچ بار دمے کی گولیاں کھلاتا رہا۔ جب جا کر اس کے ووٹ ڈالنے کے منظر کی فوٹو کھینچی —— لہٰذا منگواؤ ذرا میرے لئے آملیٹ وغیرہ۔"

ابھی ابھی جب میں یہ مضمون لکھ ہی رہا تھا۔ کہ ایک دوست نے آ کر بتایا۔ کہ بریانہ میں ایک بیمار سی عورت ایک پارٹی کے ٹینٹ کے باہر رو رہی تھی۔ کسی نے پوچھا۔ "کیوں روتی

ہو بھارت ماتا!"

وہ بولی۔" وہ سسر سے مجھے رکشا میں بٹھا کر ووٹ ڈلوانے لے آئے تھے۔ مگر اب واپس کون لے جائے۔ کوئی نظر ہی نہیں آتا سبھی غائب ہو گئے ہیں۔"

ایک ڈیوٹی کانسٹیبل کھڑا سُن رہا تھا اچانک بول اٹھا۔
"اجی، قانون کی رو سے ووٹروں کے لیے ٹرانسپورٹ مہیا کرنا جرم ہے۔"

اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مریض ووٹر ایک آنسو تھا جسے موتی سمجھ کر اٹھا لیا گیا۔ اور اب قانون کی رو سے اسے مٹی میں ملایا جا رہا ہے۔

قطار میں آیئے!

بڑے ڈاک خانے میں ایک ٹکٹیں اور لفافے بیچنے والا کاؤنٹر ہے۔ ایک شخص وہاں آیا اور کاؤنٹر کلرک سے بولا "بابوجی! مجھے ایک لفافہ اور ایک پوسٹ کارڈ دیجئے۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

کلرک نے کہا "یہاں جلدی ولدی نہیں چلے گی۔ قطار میں آیئے۔"

"جناب میں قطار میں ہوں۔"

"قطار میں کہاں کھڑے ہو۔ تم اکیلے تو آدمی ہو۔ پہلے اپنے پیچھے قطار بن لینے دو۔ اس کے بعد لفافہ دوں گا۔ آپ کو ڈسپلن سیکھنا چاہیئے۔ قطار میں اپنی مطلوبہ چیز لینی چاہیئے۔ ہمیں سرکار کا آرڈر ہے کہ قوم کو ڈسپلن سکھاؤ۔"

شکر ہے سرکار کا پہلے اور خدا کا بعد میں کہ ہماری قوم میں ڈسپلن کی عادت ڈالی جا رہی ہے۔ ہر آزاد قوم ڈسپلن کے ذریعہ ترقی کرتی ہے۔ ہم نے

آزادی کے ۲۵ سال بعد ترقی کرنا شروع کی ہے۔ اور ہر مقام پر قطار بنانے لگے ہیں۔ شمشان بھومی تک میں ارتھیوں کو قطار میں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے شمشان بھومی کے انچارج سے پوچھا۔ "آپ ارتھیوں کو قطار میں کھڑے رکھ کر ہندوستانی تہذیب کی توہین کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ جب ہم غلام تھے، جب بھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

اس نے جواب دیا۔ "جی اب ہم غلام نہیں ہیں۔ آزادی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لکڑیاں اتنی زیادہ کیاب اور مہنگی ہو گئی ہیں کہ ہم کبھی کبھی پوری قطار کا بھگتان بھی نہیں کر سکتے۔ لکڑیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور دو تین ارتھیاں بچ جاتی ہیں۔ تو ہم ان ارتھیوں سے کہتے ہیں۔ آج کا کوٹہ ختم۔ اب آپ کل تشریف لائیں۔"

میں سمجھتا ہوں یہ ایک صحت مند رجحان ہے کہ ارتھیوں کو بھی ڈسپلن قائم رکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور یہ ڈسپلن چاہے لکڑیوں کی بدولت پیدا ہوا۔ لیکن کم سے کم پیدا تو ہوا۔ ہم لکڑیوں کی مہنگائی کم نہیں کر سکتے تو کیا ہوا، ڈسپلن تو قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک سال پہلے ایک ڈپٹی منسٹر کی ارتھی شمشان گھاٹ پہنچی تو چیف منسٹر نے انچارج کو ٹیلی فون کیا۔ کہ مرحوم چونکہ وی آئی پی ہیں اس لئے کیو (Que) توڑ کر ان کا انتم سنسکار کر دیا جائے۔ لکڑیاں چیف منسٹر ریلیف فنڈ میں سے سپلائی کر دی جائیں گی۔

اور ویسے بھی چیف منسٹر نے یہ دلیل دی (نہ جانے ہر چیف منسٹر کی دلیل معقول کیوں ہوتی ہے) کہ مجھے چونکہ ایک اہم ضروری قومی کام کے لیے ساڑھے

گیارہ بجے کی فلائٹ سے کہیں چلے جانا ہے۔ اس لیے ہوائی جہاز سے آدھ گھنٹہ پہلے ڈپٹی منسٹر کی ارتھی کا بھگتان کر دیا جائے۔

میں نے ایک دوست سے کہا "ڈسپلن جب بھی توڑا ہے، قوم سے پہلے قوم کے لیڈر نے توڑا ہے"

وہ بولے ۔ "مگر قومی کاز کے لئے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے قومی لیڈر اگر کوئی ذلیل حرکت بھی کر ڈالے تو اس ذلت کو ذلت نہیں استثنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ مگر سنیما ہالوں کے باہر بلیک کی ٹکٹیں بیچنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے تو ڈسپلن پہلے قائم کیا۔ ارتھیاں ہماری دیکھا دیکھی بعد میں قطار باندھنا سیکھی ہیں۔ اور واقعی میں نے خود دیکھا ہے کہ سنیما کی بکنگ کھڑکی کے سامنے قطار میں سب سے پہلے وہی کھڑے ہوتے ہیں۔ آدھ آدھ گھنٹہ پہلے کھڑکی پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور پھر کھڑکی کھلنے کے انتظار کی زحمت برداشت کرتے ہیں۔ کبھی ایک ٹانگ کے سہارے اور کبھی دوسری ٹانگ کے سہارے لیٹتے رہتے ہیں۔ کتنی محنت شاقہ ہے۔

اور پھر قطار میں کھڑے ہو کر بیس پچیس تیس ٹکٹیں خرید لیتے ہیں اور محنتِ شاقہ کا دوسرا دور اس وقت آتا ہے جب بکنگ کی کھڑکی پر "ہاؤس فل" کا بورڈ لگ جاتا ہے اور وہ بلیکئے، خواہشمند شائقین حضرات کو فوراً بھانپ لیتے ہیں اور ان کے قریب سے گزرتے ہوئے گنگناتے ہیں "پانچ روپے والی ٹکٹ سات روپے میں"

اور بالخصوص اس جنٹلمین کے پاس سے ضرور گزرتے ہیں جس کے پاس

اُس کی محبوبہ کھڑی ہو اور یا اُس کی نو بیاہتا دُلہن، بلکہ اس سے اگر وہ سات کی بجائے آٹھ روپے بھی کہہ دے تو جنٹلمین بغیر سوچے سمجھے دے دینا ہے۔ کیونکہ یہ اُس کے پرسٹیج کا سوال بن جاتا ہے۔

ڈسپلن کے بعد ہماری قوم نے پرسٹیج سیکھا ہے ـــــ پرسٹیج کی بات چلی ہے تو یہ عرض کر دوں کہ ہم ڈسپلن اور پرسٹیج دونوں کو ساتھ ساتھ چلا رہے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے گوندھ دیتے ہیں اور چیف منسٹر بن جاتے ہیں۔ معاف کرنا درمیان میں یہ چیف منسٹر یعنی سیاست دان آ گیا ہے۔ اگرچہ خواہ مخواہ نہیں آیا۔ فرض کیجئے ایک پارٹی لیڈر اسمبلی کے الیکشن کے لئے ٹکٹیں بانٹتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

" جو جو ٹکٹ کا اُمیدوار ہے وہ قطار میں آ جائے۔"

چنانچہ امیدوار قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں ٹکٹ چالیس ہوں تو امیدوار ایک سو ساٹھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ پارٹی لیڈر چالیس امیدواروں کو ٹکٹ دے دیتا ہے۔ ایک سو بیس امیدواروں سے کہتا ہے کہ پارٹی ڈسپلن کے تحت آپ الیکشن میں کام کریں۔

جواب ملتا ہے۔ " ہم کام نہیں کریں گے اور گیٹ آؤٹ کر جائیں گے۔"

چنانچہ وہ امیدواروں کے گروپ سے گیٹ آؤٹ کہہ جاتے ہیں اور دوسری پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ذات اہم ہو، سماج، ہم نہ ہو تو گیٹ آؤٹ نہایت ضروری ہو جاتا ہے ـــــ مگر الیکشن ختم ہونے کے بعد پارٹی لیڈر کا پرسٹیج سامنے بھوت بن کر آ جاتا ہے۔ کہ چیف منسٹر تو مجھے ہی بننا چاہیئے۔ لہٰذا وہ

اپنی کوٹھی کے کاؤنٹر میں بیٹھ جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔ جو بھی ممبر دل بدلی کرنا چاہے وہ قطار میں آکر کھڑا ہو جائے۔

چنانچہ دل بدلوؤں کا ایک نیا کیو Que بن جاتا ہے۔ پارٹی لیڈر پہلے آدمی سے پوچھتا ہے — "ہماری پارٹی میں آنا چاہتے ہو تو قیمت بتاؤ؟"

"قیمت — منسٹر کی کرسی۔"

"قیمت زیادہ ہے — قطار میں دوسرا آدمی!"

اور یک وقت پوری قطار بول اٹھتی ہے "میں ڈپٹی منسٹر کی کرسی۔"

چنانچہ کچھ کرسیاں بیچ کر "ہاؤس فل" کا بورڈ لگ جاتا ہے اور پارٹی لیڈر کی حیثیت اس بلیکئے کی طرح ہو جاتی ہے جو قطار میں کھڑا ہو کر سینما کی ٹکٹیں وہ خریدتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے کیو Que میں ٹکٹیں خریدی ہیں کیونکہ کیو سے ہی قوم ترقی کرتی ہے۔ قطار میں آئیے، منسٹر بن کر قوم کی خدمت کیجئے۔ جے ہند!

غالب بنام فکر

سہ شنبہ ۱۵ دسمبر

فکر میاں ہم سوچتے تھے تم نے ذہن رسا پایا ہے لیکن تم تو ایک ہونق نکلے۔ عزیزی سمجھ کر تمہیں خبر کی تھی کہ ہم دلی آ رہے ہیں۔ تم سے آنے رہا اب جو دیکھتا ہوں ڈاک میں اخبار کے دو تراشے چلے آ رہے ہیں کہ مرزا نوشہ بہ نفس نفیس اپنی صد سالہ برسی کی نگرانی کی خاطر تشریف لا چکے ہیں۔ تراشے کی تحریر سے یوں مترشح ہے جیسے تمہیں پولیس کو اطلاع دینا مطلوب تھا کہ ایک سو سال سے جو فراری تھا، اب خود بدام آگیا ہے، پکڑ کر سیدھی حوالات لے چلو۔ خیر تم کبھی کہاں دبنے والے تھے۔ ترکی خون اور شراب ناب دونوں بیک وقت رگوں میں دوڑتے ہیں، سو ایک مراسلہ لکھا قاطع برہان قسم کا۔ اور ہرکارے کے ہاتھ اخبار کے حوالہ کر دیا کہ اسد اللہ خان نامی ایک شخص جھانسی

سے دہلی آیا۔ نام کا خان، کام کا مہا جن، کھاری باؤلی سے ملا دلی، ہینگ خریدتا اور بھائے پوچھتا پھرا۔ بھلا کہاں غالب اور کہاں ہینگ۔ نگر میاں ٹھہرا ایک مسخرا ظرافت کے مارے لکھ دیا کہ غالب آگئے اور بلیماران میں قیام رہے گا۔ اب مسخرے اتم نے یہ نہ سوچا کہ اب تو سو سال بعد وہ ملک الشعرا قرار پایا ہے۔ اب کیوں بلیماران میں رہے گا۔ کسی وزیر امیر کا شیش محل اس پہ دا نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ لوگوں کے ہجوم نے بلیماران پر ہلہ بول دیا۔ سنتا ہوں لاٹھی چارج بھی ہوا مگر بلیماران کے ہر گھر سے کورا جواب ملا کہ ہم غالب شالب کو نہیں جانتے۔ یہاں تو نجر ہے، کمہار، کچھ طبیب اور بھٹیارے رہتی ہیں ـــــ سو میاں! صبح کے اخبار میں ہمارا مراسلہ پڑھ لینا۔ اثر خاطر خواہ ہو گا۔ اتنا ہمارا یقین ہے۔ سنا ہے جشنِ صد سالہ کمیٹی والے ہمارے مزار پر بھی ٹھینکتے پھرتے کہ شاید گوہر مراد یعنی غالب حاصل ہو تو اُسے گرفتار کر کے کوتوالی میں دے دیں۔ کہہ دیا ہے جشنِ غالب فنڈ پر ہاتھ صاف کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ہم خود فنڈ پر کیوں ہاتھ صاف نہ کریں۔ میاں نکیا سنو، بھانڈ مت بنو، ہمارا ٹھکانہ دہلی میں صرف تمہیں معلوم ہے یا ایک سیٹھ بلاقی رام کہ جس سے ہماری صاحب سلامت تھی۔ فاقہ مستی میں اس کے سہارے پاؤ بھر شراب اور شوربہ گوشت کی ایک پلیٹ چلتی تھی۔ لہٰذا آسرے کو ہمارے قیام کی خبر کیوں دو۔ چند دن کے لئے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے دو ـــــ تمہاری صحت اور عقل دونوں کے لئے دعا کا طالب ـــــ غالب

پنجشنبہ - ۱۷ دسمبر

میاں، خوش رہو کہ دلی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے مگر تم ابھی تک وہیں
ہو۔ رم کی بوتل کھینچ کر تم یہ سمجھے کہ خوش رہا اور یہاں یہ شرم کہ کیسے بتائیں
کہ اس بادۂ سیاہ کاریں شراب کہاں، بس سیاہ کاری ہی بھیا رہی تھی۔ رم آیا تو تشنہ تھا۔
کہ ہائے دہر کا اس پہ اتفاق تھا کہ گئی تو آہستہ سے رسیدہ نکلی۔ یعنی ادھر اندر گئی
اُدھر نشہ ہرن کی طرح بھاگ گیا۔ جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔ بس ہوا یہی کہ دماغ سے
پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ انتڑیاں سرک گئیں کہ

یاد آیا مجھے پانی کا ہوا ہو جانا

خیر اس میں نہ تمہاری گمان زنی نہ ہم بے گناہ۔ ایک اہل نظر نے انکشاف
کیا کہ دلی میں یہ بدمستی عام ہے۔ رم شراب کے جز خالی آب کے۔ فوج
کے توشہ خانے سے بوتل میں دھڑا دھڑ مال آرہا ہے۔ اس میں فوج کی کیا
تقصیر، رسوائی تو میگساروں کی ہے کہ ایسے مال کی تربیت انہی کے دم سے ہے۔
دو چار قدح خواروں سے گفتگو پر معلوم ہوا کہ مرزا! معیار سے جسے تم آبرو کہو
وہ تو گیا بہادر شاہ ظفر کے ساتھ۔ اب تو افلاس کا دور دورہ ہے۔ بلکہ افلاس
اور بدذات دونوں کا دور دورہ ہے۔ دونوں کی دانت کاٹی روٹی ہے۔
اس لئے اگر قدر دانیٔ شعر ملحوظ خاطر ہے تو کسی چور بازاریئے، کسی رشوت
باز، کسی کوتوال شہر کی بزم میں جاؤ، جو بدذات اور افلاس دونوں کی قبر پہ جام
مے کا جھنڈا گاڑے بیٹھا ہے اور پکارتا پھرتا ہے "ہے کوئی مرتی ہوئی
تہذیب کا وارث، جو ہم سے یہ جھنڈا پگڑی دے کر خرید لے۔"

فکریاں جی! تم مجھ سے دلی کا حال کیا پوچھو، تمہیں لکھوں تو ڈھونڈ ڈھونڈ رہا ہے
دے گے کہ ایسا غالب کہتا ہے۔ اس لیے چھپے ہوں۔ ورنہ ہائے! کیا دلی تھی یلیماؤن
ہے، لال قلعہ تک تمنائیں فرش راہ بن جاتی تھیں کہ غالب آ رہا ہے۔ کل جو لال
قلعہ سے گزر ہوا تو انجمن گنول کر بیٹھی ہوئی ایک پر شباب حسینہ کہ چہرے
مہرے سے فرنگی لگتی تھی، مجھ سے بولی "ہم انڈیا کے کلچر سے لو کرنا مانگتا۔
ہمیں بتاؤ یہ لو کہاں سے گا؟" — ہم نے ازراہِ تمسخر کہہ دیا کہ برلا منر جاؤ۔
اس کے باہر کھڑے ہو کر جو بس بیچو، ہم اسے خدمتِ تہذیب سمجھیں گے کیونکہ
یہی ہمارا شیوہ رہا ہے۔

میاں فکر! یہ کہنے کے بعد لال قلعہ کی دیوار کے ساتھ سر رکھ کر جو میں
زار و قطار رو دیا ہوں۔ تو ہر راہ گیر یہ سمجھا کوئی رفیوجی ہے، فریاد کرتا ہے۔
صرف ایک کمبخت ذہن ایسے گزرے جو شک کرتے تھے کہ غالب ہے۔
اس کی اطلاع دہلی کے بڑے لیفٹیننٹ گورنر کو دینی چاہیے ایک دنیا میں
کھینے میں بس ایک بھیڑ کی کسی ہمارے ارد گرد منڈلانے لگا۔ پوچھا، دا جرادے
۔ تم میر تقی میر تو نہیں ہو، اور نہ یہ رونا تمہارے سے متعلق، تم کوچۂ عطاران
کے کوئی لونڈے ہو، ہم کو اس سے کیا غرض؟ بس اکڑ گیا۔ پھولے ہوئے نتھنوں
سے آواز آئی "ہنہہ! چھوڑو، چھان! بڑے میاں! ریش دید دست کو سنبھالو
چھوڑو رستے منہ نہ آؤ۔ پگڑی اچھال دیں گے، سر بازار رسوا کر ڈالیں گے۔
زبانت کی ایسی نوچ کھسوٹ کر کھائیں گے — ہم سمجھے کوئی جلاد زادہ ہے، تیور
بھانپ گیا۔ ایک کہاری قبا پکڑلی۔ بولا ہم جلاد نہیں ہیں قبلہ انگلی ی

ینگ مین ہیں۔ پیشہ سے رائیٹر کہلاتے ہیں، بڑے بڑے جغادری، مرغِ قبلہ نما ہمارے آشیانے میں پڑے تڑپتے ہیں۔ ہم نے پوچھا، غالب نامی ایک مرغ تھا، تمہارے آشیانے میں اس پر کیا گزرتی ہے۔ تڑاق سے بولے، وہ تو آشیانے سمیت فرار ہو گیا۔ صد سالہ جشنِ غالب میں اُس کے خلاف ایک مقالہ پڑھوں گا اور دوسری مرتبہ اُس کا جنازہ اٹھوا دوں گا۔" ہم نے مرحبا کہا۔ ایک چونی بغرضِ چائے نوشی اُسے مرحمت کی۔ شکایت کرتا تھا کم ہے۔ بھنگ کا گلاس آٹھ آنے میں آتا ہے۔ نجانے بیچارے پر کیا گزری۔ لیکن فکر میاں! تاسف کا ہاتھ ملتا ہوں کہ دہلی کا علم و ادب خطاروں کے لونڈوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ ہماری ان کی نبھے گی کب تک؟

——— خطا کیش ——— غالب

یکشنبہ۔ ۲۰ دسمبر

فکر میاں جی کو گنہگار غالب کا سلام پہنچے۔ ذرا ہمارا استغنا دیکھو۔ لیفٹننٹ گورنر نے ہماری عزت افزائی کے لئے کار ارسال کی کہ مرزا غالب کو بٹھا کر مرزا غالب پر لے چلو۔ ہم آتے ہیں۔ ادھر ہمیں عزت اور بے عزتی کا فرق پہلے سے معلوم تھا۔ ڈرائیور سے کہہ دیا ہم گورے فرنگی سے نہ دبے۔ اس کالے فرنگی سے کیا ڈریں گے۔ گاڑی مع پیغام لوٹا دی اور ان سے کہو گورنر صاحب! عزت صرف گورنر کی نہیں ہوتی، شاعر کی بھی ہوتی ہے۔ شاعر کی عزت انہیں مقصود تھی تو خود تشریف لاتے اور احترام سے لے جاتے۔

اب نہیں جائیں گے۔ کیونکہ پا گئے ہیں کہ اب شاعری ذریعۂ عزت نہیں رہی۔ اب مزار ہی مزار ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ غالب سے مزار غالب کی عزت زیادہ ہے۔ مستورات کی بے حجابی اور زیارت کی بے حجابی دونوں دیکھتا ہوں اور کڑھتا رہا۔ اچھا، یہ بتاؤ، یہ لیفٹننٹ گورنر کو ہمارے قیام دہلی کی اطلاع ملی، یہ کیسے ممکن ہوا؟ ضرور تم نے بہم پہنچائی ہوگی۔ یہ شجر ممنوعہ تو نہیں۔ لیکن بیچارے گورنر کو ہماری جنت سے نکالنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا تم سے سمجھے اور گورنر صاحب کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرے۔ اس رقعے کا جواب مت بھیجو۔ میرے قیام و طعام کا بندوبست کسی اور جگہ ہو گیا ہے۔

تم سے نجات کا طالب ـــــ غالب

سہ شنبہ - ۲۲ر دسمبر

ارے میاں! کل والا رقعہ لکھ کر پچھتا رہا ہوں، وہ تمہارے نام نہیں تھا۔ میں اور تم پر شک کروں؟ گردن زدنی، راج دربار میں ہمارے عزت بڑھے اسی خاطر تم نے گورنر بہادر تک ہمارے وُرُود کی اطلاع بھیج دی۔ قصور تو ہمارا تھا کہ ہم اپنی پرانی وضع نہیں بدل سکے۔ تم ہمارے بارے میں غلط فہمی نکال دو، خوش فہمی قائم رکھو۔ مگر ایک بات گرہ باندھ لو کہ استغنا سے اب بھی ہاتھ نہیں دھوئیں گے ـــــ اچھا ایک لطیفہ سنو کہ کل شام اپنے مزار پر جا پہنچے۔ کار کو چھوڑ کر پاپیادہ۔ تم ہنسو گے۔ لیکن میاں! اس سے ایک تو استغنا برقرار رہا، جو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دوسرے چھوٹی

نمود و نمائش سے بچے کہ زاغ و زغن ہمارا استقبال کرتے، ہاتھی سونڈ اٹھا کر
سلامی دیتے اور کوئی کالا چہرہ آگے بڑھ کر گردن میں پھولوں کا ہار ڈال دیتا کہ
جیسے قیدی کو زنجیر ڈال دی ۔۔۔ مزار پر قوالیاں ہو رہی ہیں۔ قیدی بھی قفس
کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ ایک دنبالہ دار سیاہ فام برعکس نہند نام
زنگی قوال ہماری غزل گا رہا تھا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

پہلے تو اپنی فہم سے اپنی غزل ہی بالاتر معلوم ہوئی۔ مگر گوش ہوش
لگا کر سنا تو قوال صاحب کچھ یوں لب کشا تھے ؎

کچھ خانصاحب میں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
ہائے ہائے کیا کیا صورتیں تھیں، عورتیں تھیں پنہاں ہو گئیں

سر پیٹ لیا۔ احتجاج کرتے نہ بنی کہ افشائے راز کا خطرہ لاحق تھا۔ ایک
مست الست قریب سے گزرا۔ قریب تھا کہ نعرہ انا الحق لگاتا کہ ہم نے جا لیا۔
کیوں صاحب! صورت شکل سے ذہنی، چال ڈھال سے شناسا معلوم ہوتے
ہو۔ اپنا حسب و نسب بتاؤ۔ جیب سے شیشے کی صراحی نکال کر لہرائی کہ ہم غالب
کے شاگرد عزیز ہیں۔ ساغر تخلص کرتے ہیں، یہ جو سب دیکھتے ہو، تصنع ہے،
فریب ہے۔ اسرار اور رموز سا کی ذہنی عیاشی کا سامان ہے۔ غالب حقیقی سے
دعا ان کے نصیب میں کہاں ۔۔۔ ہم رند ہیں، غالب کے صحیح محرم راز۔ یہ
کہا اور تیزی سے مزارِ غالب کی سفید چادر پر شیشے کی صراحی انڈیل دی اور نعرہ لگایا۔
اے قبلۂ رندان جہاں! اپنی عزیز ترین تمنائیں کشید کر کے حضور کی خدمت میں

پیش کر رہا ہوں۔ قبولیت مرحمت ہو۔ ہمارے ہاتھ جب دعا کے لئے
اٹھ گئے غرض یہ تھی کہ اے اہلِ عرش! ہم نے اپنی طرف سے نذرانہ قبول
کیا تم اس پر تصدیق کی مہر لگا دو۔ ابھی چند ثانیے بھی نہیں گزرے تھے
کہ دعا کا اثر سامنے آگیا۔ کوتوال شہر نے آگے بڑھ کر اس دستِ الفت کو زنجیریں
پہنا دیں کہ خلل ڈالتا ہے۔ بڑے وزیر صاحب سخت خفا ہوتے ہیں کہ یہ
ناہنجار میر کا اور غالب دلوں کی اہانت کرتا ہے۔ میاں نکیر! اب بولو، تمہاری
اس دلی میں یہ کیسے فرشتے آگئے ہیں کہ ناحق پکڑ لیتے ہیں۔ ان گنجے فرشتوں کو ناحق
میسر آگئے ہیں تو اپنی دنیا کو لہولہان کریں۔ دوسروں کا ماس کیوں چھیلتے ہیں۔ میں
تو کل دہلی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کوتوال شہر سے اپنی دیرینہ عادت ہے
کہیں ہمیں بھی پکڑ کر گرفتار نہ کر لے۔ بہانے تراشنے میں ماہر ہے۔ سرکاری
میں بہانے تراشنا اس کا شیوہ رہا ہے۔ الزام لگا دے گا کہ ڈرائی ڈے پر میگساری
کر رہا تھا۔ حالانکہ ایک دانائے راز کا کہنا ہے کہ کوتوال شہر اور اس کے حواری
ڈرائی ڈے پر سب سے زیادہ میگساری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن ان پر ہاتھ ڈالے۔
جو ڈالے وہی شاہ کی مصاحبت سے خارج تھے۔ شاید ہمیں کیا عذر۔ لیکن
ذرا یہ بھی تو سوچو کہ ایک میں بھی فرق تو کوئی نہیں پڑا۔ رہی غالب اور کوتوال جو کل
تھا سو اب بھی ہے۔ جب تک شعر و ادب پر کوتوال شہر کا تسلط رہے گا، ناطقہ
سر بگریباں ہی رہے گا۔ اور غالب بار بار دہلی چھوڑ کر فرار ہوتا رہے گا۔ سو ہم تو چلے۔
تم خوش، تمہارا کوتوال خوش، تمہارا خدا خوش!

سوگواری کا قالب ——— غالب

جس کا کام اُسی کو ساجے

"کیا آپ شُودر ہیں ؟"

"جی، پیدا تو انسان کے طور پر ہوا تھا۔ بعد میں شودر بنا دیا گیا۔"

"ارے، عہدہ تو ہمیشہ بعد میں ملتا ہے۔ اب مجھے دیکھو پیدائش کے وقت انسان تھا۔ بعد میں لیڈر بنا دیا گیا۔ بہرکیف تم چونکہ آج کل عہدۂ شودر پر ہو اس لئے تمہارا کام ہے گھروں کا کوڑا کرکٹ اٹھانا۔"

"اور آپ کا کام ؟"

"جلسے میں اپنی گل پوشی کروانا اور تم شودروں کی حالت زار پر آنسو بہانا!
میرے پاپ کا کیا ہے...!! اسی طرح سوسائٹی نے ہر آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی کام مقرر کر رکھا ہے۔ کچھ لوگ کوڑا کرکٹ اٹھاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ انہیں کمزور طبقہ کہہ کر آنسو بہاتے ہیں۔ اور ایک آدمی کی ڈیوٹی ہے

کر آنسوؤں کو الیکشن کمشنر کے پاس لے جائے۔ اور کیش کرا لائے۔ اپنا کمیشن کاٹ کر باقی (نقدی) لیڈر کے حوالے کر دے۔ اس آدمی کو کمیشن ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اُسے دلال بھی کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ رنڈیوں کے بھی دلال ہوتے ہیں۔ اس لئے اُسے دلال نہیں کہا جاتا۔ سوشل ورکر کہا جاتا ہے۔

اگر لیڈر اپنی مقدار سے کچھ زیادہ آنسو بہائے۔ یعنی گلیسرین کے آنسو بھی شامل کر لے تو وہ ترقی کر کے وزیر بن جاتا ہے اور جب لیڈر ترقی کر جائے تو سوشل ورکر بھی ترقی کر جاتا ہے یعنی اسمبلی کا ممبر بن جاتا ہے۔ آپ اس سے پوچھیے "جناب! اب سوسائٹی نے آپ کے ذمہ کیا کام لگایا ہے؟"

"آیا رام، گیا رام بننا۔"

"سوسائٹی نے آپ کے ذمے یہ کام کیوں لگایا؟"

"کیونکہ اس سے سوسائٹی چلتی ہے، بلکہ کیبنٹ چلتی ہے۔ اگر میں یہ کام نہ کروں تو کیبنٹ ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ بڑا گند مچ جاتا ہے۔"

"یعنی جیسے شودر کوڑا کرکٹ نہ اٹھائے تو گند مچ جاتا ہے۔ قبلہ! آپ شودر ہیں یا کوڑا کرکٹ؟"

مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی مثبت یا منفی یا دونوں جواب دے، ایک اور آدمی آتا ہے اور اُسے کار میں اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ سوسائٹی نے اس کے ذمے یہ کام لگا رکھا ہے کہ جب چیف منسٹر کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیشن پیش ہوتا ہو تو اسے جتنے آیا رام، گیا رام دکھائی دے جائیں، انہیں اغوا کر کے کسی غار میں لے جائے۔ غار اگر کنڈیشنڈ ہو۔ وہسکی اور

مرغے وغیرہ کا دسترخوان آراستہ ہو۔

غرض سوسائٹی نے اپنے آپ کو چلانے کے لئے مختلف آدمیوں کے ذمے مختلف کام لگا رکھے ہیں۔ انگریزی میں اسے "ڈویژن آف لیبر" کہتے ہیں۔ یعنی محنت کی تقسیم — منومہاراج نے بھی ایک ڈویژن آف لیبر کی تھی۔ یعنی سوسائٹی کے کام کو چار ذاتوں میں بانٹ دیا تھا۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر — مگر ماڈرن زمانے میں یہ گڑبڑ ہو گئی۔

کل میں نے ایک برہمن زادے کو دیکھا۔ وہ گلی میں آواز لگانے لگا۔ "ردی اخبار رسالے"

میں نے پوچھا۔ "اے برہمن پترا تمہارا دھرم تو پڑھنا پڑھانا ہے۔ تمہیں تو اخبار کا ایڈیٹر ہونا چاہیے تھا۔ تم تو مذاق کر رہے ہو کہ ردی کا کام کیوں کرتے پھرتے ہو؟ — یہ تو ویش کا کام ہے، برہمن کا نہیں۔"

وہ بولا۔ "برہمن نالائق تھا۔ پڑھنے لکھنے کی عادت بھی پاس نہیں کر سکا تو کیا کرتا۔ پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے ردی تولی۔ تولنے میں ڈنڈی مار لی۔ برہمن کا کام سوسائٹی کو یہ تعلیم دینا تھا کہ ڈنڈی مار کر بے ایمانی مت کرو۔ مگر اب برہمن پتر خود ڈنڈی مار رہا تھا۔ کیا کرتا پیٹ تو کسی طرح بھرنا ہی تھا۔

منومہاراج کی روح پر کیا گزر رہی ہوگی، یہ صرف بھگوان جانے یا وہ برہمن جانے، جو دیش بھر کو پوری دنیا میں فلاسفی کا سبق پڑھا رہا تھا۔

میں نے ایک کھشتری کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے

دیکھا ۔ میں نے پوچھا ۔ " مسٹر بھکاری! آپ کا اسم شریف؟ "

وہ بولا ۔ " میں مغل شہنشاہ عالمگیر ثانی کی نواسی کا بیٹا ہوں ۔ میرا نام فرخ سیر چہاردہم ہے ۔ "

" تو پھر آپ نے بھیک کا ٹھیکرا کیوں اٹھا لیا ۔ شمشیر کیوں رکھ دی؟ "

" شمشیر کے لئے لائسنس فیس دینی پڑتی ہے اور فیس بہت زیادہ ہے۔ جب کہ بھیک کے ٹھیکرے کے لئے لائسنس نہیں لینا پڑتا ۔ فیس بھی نہیں دینی پڑتی ۔ "

" ہاں، جدید ڈیموکریٹک عہد میں ۔ ڈویژن آف لیبر بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے ۔ کھتری بھیک مانگتا ہے، کوئی اعتراض نہیں کرتا، ٹھیکرے کے لئے فیس نہیں دینا پڑتی ۔ سول لبرٹی ہے ۔ ایک کانسٹیبل آتا ہے۔ بھکاری شہزادے کو ڈنڈا مارتا ہے ۔ " اٹھو! سور کی اولاد! بھیک مانگنا جرم ہے ۔ "

" میں سور کی نہیں، مغل خاندان کی اولاد ہوں ۔ "

" تم چاہے کچھ بھی ہو، مگر اس وقت گداگر ہو اور میں تمہیں انسداد گداگری ایکٹ کے تحت جیل بھجوا سکتا ہوں ۔ "

گداگر نے اُسے اپنی آمدنی کا پچیس فیصد یعنی چالیس پیسے بطور رشوت دے دی ۔ سوسائٹی نے کانسٹیبل کے ذمہ یہ کام لگا رکھا تھا، " قانون کی حفاظت کرو، ڈنڈا دکھاؤ، رشوت لو ۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا " کانسٹیبل! تمہاری ذات؟ "

وہ بولا ۔ میں دیش ہوں ۔ میرا باپ راشن ڈپو ہولڈر ہے ۔
یعنی پھر وہی گڑبڑ ! بندوق، دیش کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے ۔ اور دیش کھشتری کو ڈنڈا مار رہا ہے ۔ میں ایک سرکاری افسر کے ہاں بیٹھا تھا ۔ اُس نے ایک چپراسی کو آواز دی ۔ پانی کا ایک گلاس لاؤ ۔

چپراسی نے کہا ۔ " صاحب ! میری ڈیوٹی پانی پلانا نہیں ہے ۔ یہ ڈیوٹی دوسرے چپراسی کی ہے ۔ "

دوسرا چپراسی بلایا گیا ۔ وہ بولا ۔ " صاحب ! گلاس ٹوٹ چکا ہے ۔ پانی کس گلاس میں لاؤں ؟ "

" نیا گلاس لے آؤ ! "

" صاحب ! نیا گلاس مہیا کرنے کی ڈیوٹی میری نہیں ہے ۔ سٹور کیپر کی ہے ۔ "

سٹور کیپر کو بلایا گیا ۔ اُس نے کہا ۔ " جناب نیا گلاس منظور کرنا میرا کام نہیں ہے یہ پرچیزنگ آفیسر کا کام ہے ۔ میرا کام تو صرف سپلائی کرنا ہے ۔ "
اور کہتے ہیں ۔ ڈھائی مہینے بعد جب نیا گلاس آیا تو عین اُس وقت افسر کا ہارٹ فیل ہو گیا ۔ اور دفتر میں یہ بحث جاری تھی کہ سوسائٹی نے اس کی ارتھی اٹھانے کا کام کس کے ذمّے لگا رکھا ہے ؟

بالائی آمدنی

رشتے کی بات چلی تو لڑکی کے مظلوم والد نے کہا (ہندوستان میں ہر لڑکی کا والد مظلوم ہوتا ہے)۔ "لڑکا کیا کام کرتا ہے؟"

"بظاہر تو لوئر ڈویژن کلرک ہے، لیکن دراصل میونسپل کارپوریشن میں ڈاکٹر کی ڈیوٹی پر تعینات ہے" دلال نے جواب دیا۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو دلال نہیں کہتا تھا۔ "آدرش میرج بیورو" کا منیجر تھا۔ اور کبھی کبھی جب کوئی نہیں سن رہا ہوتا تو اپنے آپ کو جنرل منیجر بھی کہہ دیتا تھا۔

رشتے کی بات پکی ہو گئی، کیونکہ کلرک جب ڈگری کے بغیر ڈاکٹر بن جائے تو مطلب صاف ہے کہ وہ بالائی آمدنی کے دہانے پر بیٹھا ہے۔ لوگ اپنی بیٹی کا رشتہ بالائی آمدنی سے کرتے ہیں۔ اصلی داماد تو بالائی آمدنی ہے۔ باقی تو سب لوئر ڈویژن کلرک ہیں۔ نقلی داماد ...!

"جناب! یہ جو گھوڑی پر سہرا باندھے ہوئے داماد بیٹھا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"بالائی آمدنی۔"

"اور جو گھوڑے کے پیچھے بیٹھا ہے؟"

"اجی! یہ تو لوئر ڈویژن کلرک ہے۔ اسے بالائی ہی سمجھئے۔"

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے پورا ہندوستان بالائی آمدنی کے سہارے ہی جی رہا ہے۔ جونہی کسی کی بالائی آمدنی ختم ہوتی وہ اپنے لواحقین سے کہتا ہے۔ "اب میری ارتھی تیار کرو۔ اب اس ہندوستان میں جینے کا کوئی مطلب نہیں رہا۔"

یہ اور بات ہے کہ شمشان بھومی کا انچارج کہہ دے کہ "صاحب آج تو لکڑیوں کی بے حد قلت ہے ارتھی کل لے آنا۔"

لواحقین خوشامد کرتے ہیں: "دیکھئے انچارج جی! ارتھی واپس گھر لے جانا درست نہیں ہے اور پھر بڑی مشکل سے تو پڑوسی اس ارتھی میں شرکت کے لئے راضی ہوئے ہیں۔ کل نہ جانے کسی کے پاس ٹائم ہو یا نہ ہو۔ ہر آدمی کی ذاتی مصروفیات ہوتی ہیں۔ اس لئے بھگوان کے نام پہ ہماری لاش رکھ لیجئے۔ اور آج ہی لکڑیوں کا بندوبست کروا دیجئے۔"

انچارج بھگوان کو نہیں مانتا۔ بالائی آمدنی کو مانتا ہے۔ لہٰذا وہ قلت کی لکڑیوں کے ذریعہ بالائی آمدنی کر لیتا ہے۔ لاشیں بالائی آمدنی پیدا کرنے کا معقول ذریعہ ہیں۔

آپ کسی بھی ہندوستانی سے پوچھئے "صاحب! اس بڑھتی ہوئی مہنگائی نے بھی آپ کی کمر نہیں توڑی۔ کیا وجہ ہے۔ کیا وجہ ہے۔ کیا آپ کے کمر نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں، نہ صرف کمر موجود ہے بلکہ اتنی مضبوط ہے کہ مہنگائی کی کمر توڑ دی ہے۔"

"کیسے۔"

"بالائی آمدنی سے۔"

غرض ہر ہندوستانی بالائی آمدنی کو اصلی آمدنی سمجھتا ہے اور ناجائز آمدنی کو نقلی آمدنی۔ میں نے کئی حضرات سے پوچھا "جناب! آپ جو یہ سکاچ وسکی نوش فرما رہے ہیں وہ کس آمدنی سے آئی ہے؟"

"بالائی آمدنی سے۔"

"اور جائز آمدنی کہاں ہے؟"

"اسے وسکی میں بطور سوڈا واٹر ملا دیا ہے۔"

"ہاں، جائز آمدنی سے زیادہ سے زیادہ سوڈا واٹر خریدا جا سکتا ہے۔ یا بوٹ کے تسمے۔ ورنہ ڈیڑھ سو روپے کے بوٹ تو بالائی آمدنی سے ہی خرید سے جا سکتے ہیں۔ میں نے نرمان بھون کے ایک کلرک کو ڈیڑھ سو روپے کے بوٹ خریدتے دیکھا تو اس سے یہ پوچھا کہ آپ کی تنخواہ چھ سو روپے ماہانہ ہے۔ ڈیڑھ سو روپے کے بوٹ کیسے خرید رہے ہو۔"

اس نے جواب دیا "اجی کیا کروں۔ اسامیاں دفتر ہی میں آکر بالائی آمدنی

دے جاتی ہیں۔ تو چار و نا چار ڈیڑھ سو روپے کے بوٹ خریدنا ہی پڑتے ہیں۔
تنخواہ کے روپے تو اس بوٹ پر پالش کروانے کے ہی کام آتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، نروان بھی ہیں آپ کا نروان ہو رہا ہے؟"

"ہاں میرا بھی، دلالوں کا بھی، سب کا، پورے ہندوستان کا نروان اسی
بالائی آمدنی سے ہو رہا ہے۔"

بھارت کے اس ہول سیل نروان پر سوچتے سوچتے ایک پرانا لطیفہ یاد
آجاتا ہے۔ اسکول ٹیچر اور اس کا ایک دوست سیٹھ برلا کی ایک بہت بڑی
فیکٹری کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ اس وسیع و عریض فیکٹری کو دیکھ کر
سکول ٹیچر نے دوست کا ساتھ ... ہاں! ایک سرد آہ بھی بھری۔

دوست نے پوچھا "یہ سرد آہ کیوں؟"

ٹیچر بولا "یہ سوچتا ہوں۔ سیٹھ برلا کے پاس اتنے کاروبار اور فیکٹریاں
ہیں مگر سیٹھ برلا ان سے کچھ خاص کمائی نہیں کر رہا۔ اگر یہ فیکٹریاں میرے
پاس ہوتیں تو میں سیٹھ برلا سے زیادہ کما لیتا۔"

"وہ کیسے؟"

"ارے بھائی! میں ساتھ ہی دو چار ٹیوشنیں بھی کر لیتا۔"

گویا یہ ٹیوشنیں سیٹھ برلا کی بالائی آمدنی ہوتی۔ سیٹھ بننے کے باوجود ہندوستانی
اپنی بالائی آمدنی کی خصلت نہیں چھوڑتا اور اوپر سے دو چار ٹیوشنیں ضرور کر لیتا
ہے۔ گذشتہ دنوں ایک مسٹر آیا رام میرے پاس آئے۔ میرے ایک مضمون کی
تعریف کرنے کے بعد کہنے لگے "مجھے آج پانچ روپوں کی سخت ضرورت ہے۔

دے دیجئے۔"

میں نے کہا۔" میں نے اپنی تعریف کا ریٹ پچیس پیسے رکھ چھوڑا ہے۔
لیجئے پچیس پیسے۔"

وہ بولے۔" نہیں ایک روپیہ پچیس پیسے دیجئے۔"

" یہ ایک روپیہ زائد کس کے لئے۔"

" یہ میری بالائی آمدنی ہوگی۔"

دوسرے دن گیارام سے ملاقات ہوئی، وہ ایک پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی کی طرف بھاگے جارہے تھے۔ میں نے پوچھا۔" حضرت! دوسری پارٹی کی طرف کیوں جارہے ہیں؟"

بولے۔" وہاں بالائی آمدنی کا چانس زیادہ ہے۔"

" اور اگر پہلی پارٹی میں چانس اور زیادہ نکل آیا۔"

" تو ادھر بھاگ جاؤں گا۔"

میں نے شیو کی

جونہی میں شیو کرنے کے لئے واش بیسن کے سامنے کھڑا ہوا تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میرے ساتھ یہ اندوہناک سانحہ اکثر ہوا ہے۔ نہ جانے ٹیلیفون کرنے والوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ نکڑ ذلسوی اب شیو کرنے پہ سو فیصدی آمادہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس کی ٹانگ کھینچی جائے۔

اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ عبرتناک سانحہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ ایک بڑھیا کا جنازہ تیار ہو گیا۔ جنازہ اٹھانے والے بھی اپنے اپنے کندھے سنبھالے اٹینشن ہو گئے۔ مگر جونہی وہ جنازہ اٹھانے لگے بڑھیا کی آواز آئی: ارے بیٹو! مجھے کدھر لے جا رہے ہو؟

میرے لئے ٹیلیفون کی گھنٹی اس بڑھیا کی آواز کے برابر تھی۔

شیو چھوڑ کر میں نے ریسیور اٹھایا۔ آواز آئی " ہیلو! کیا صدیقی صاحب ہیں - ؟ "

میں نے کہا " وہ دو دن پہلے موجود تھے مگر آہ! اب تو جنازہ تیار ہیں ہے - "

" جنازہ ؟ صدیقی صاحب کا ؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ اکبرا ینڈ اکبرا ینڈ اکبر کمپنی سے بول رہے ہیں ؟ "

" نہیں جناب! یہ فکری تو نسوی ہیر کٹنگ سیلون ہے۔ لہذا رانگ نمبر! "

اور ریسیور رکھ دیا۔ ٹیلیفون پر نہیں بلکہ تپائی پر۔ تاکہ شیو کرتے وقت کسی اور کا ٹیلیفون آہی نہ سکے۔ تپائی پر رکھا تو میری بیوی کہنے بلکہ فرمانے لگی " اگر کوئی ضروری ٹیلیفون ...... میرا مطلب ہے وہ تو نہیں آسکے گا ! "

" کیا تمہارا کوئی ضروری ٹیلیفون آنے والا تھا ؟ "

" ہاں میرے انکل کی پتھری کا آج آپریشن ہونا تھا اور میں اُس کے نتیجے کے لئے بے چین تھی - "

بیوی کے انکل صاحب کی عمر ستر برس تھی جو ہندستان جیسی کے لئے نہایت موزوں عمر تھی۔ نہ جانے لوگ زیادہ سے زیادہ جی کر سماج کی مزید ضربیں سہنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ ادھر بیوی کی بے چینی اور ادھر میرا شیو کا پروگرام ـــــ مگر بیوی جیت گئی۔ چونگا پھر ٹیلیفون پر رکھ دیا گیا۔ اگرچہ انتقاماً میں نے سوچا کہ اگر بیوی کے انکل والوں کا شیو کرتے کرتے کوئی ٹیلیفون آگیا تو میں بھی جواب میں کہہ دوں گا " رانگ نمبر! "

بہر کیف میں پھر شیو کرنے بیٹھ گیا۔ میں "میڈان انڈیا" بلیڈ استعمال کر کے اپنی دیش بھگتی کو اور زیادہ ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ذلیل ہونے کے لئے ۲۵ سال کافی ہوتے ہیں۔ گزشتہ دنوں جرمنی سے میرے ایک دوست نے امپورٹڈ بلیڈوں کا ایک پیکٹ بطور تحفہ بھجوایا تھا۔ اور میں نے اُسے بطور خیرات وصول کر لیا تھا۔ شیونگ کے ڈبے میں سے وہ بلیڈ نکالنے لگا تو پیکٹ کا پیکٹ ہی غائب!

میں نے بیوی کو زور سے للکارا کیونکہ زور اپنوں پر ہی چلتا ہے۔

"کہاں گیا وہ امپورٹڈ بلیڈوں والا پیکٹ؟" — ہمارے گھر میں یہ رجحان پوری طرح پروان چڑھ چکا ہے کہ کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں ملتی۔ جہاں سر کو لگانے والے تیل کی شیشی رکھی ہوتی ہے وہاں آپ کو منّے بچے کا پلاسٹک کا ہوائی جہاز رکھا ہوا ملے گا۔ اور جہاں میرے بوٹ رکھے رہتے ہیں وہاں کوئی فلمی رسالہ پڑا ہوا ملے گا۔ جس کے پہلے صفحہ پر دلیپ کمار کی دونوں بیویوں کے سہ رنگے فوٹو چھپے ہوتے ہیں۔ جبکہ ایڈیٹر کی طرف سے یہ خوش خبری بھی چھپی ہوتی ہے کہ تیسری بیوی کا انتظار کیجئے حالات بڑے سازگار ہو رہے ہیں۔

جیسے اسمبلی کے آزاد ممبروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا کہ اپنی آزادی بیچنے کے لئے کس پولیٹکل پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں لگے ہوئے ہوں گے۔ اسی طرح ہمارے گھر کی ہر چیز بھی اسمبلی کا آزاد ممبر بنی رہتی ہے۔

بیوی نے جواب دیا۔ "ابھی ڈھونڈ کر دیتی ہوں۔ کل آپ کے پوتے

کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔"

اور پیتا صاحب سوئے ہوئے تھے۔ بلکہ ممکن ہے، وہ بھی اپنے ٹھکانے پر نہ ہوں بلکہ سوتے سوتے ہی ایور ریڈی بلیڈ بن کر جرمنی پہنچ چکے ہوں۔

شیو کا اچھا بھلا موڈ بنایا تھا، مگر اب بدن میں ذہنی عن ہونے لگی۔ موڈ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جیسے بھجن لال کو چیف منسٹر بنتے دیر نہیں لگتی۔ مگر بیوی ساتھ ہی ساتھ کہے جا رہی تھی۔ "آپ چہرے پر شیونگ کریم تو لگائیے میں بلیڈ ایک منٹ میں ڈھونڈھ دوں گی۔ بلیڈوں کا پیکٹ خشک دودھ کے ڈبے میں رکھا ہوا مل جائے گا۔ میں خشک دودھ اور پوتے کے تعلقات کو بڑی اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

چنانچہ میں شیونگ کریم لگانے لگا تو باہر دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔" فکر صاحب تشریف رکھتے ہیں کیا۔؟"

میرا جی چاہا، کہ نوداردصاحب کو یہ کہہ کر باہر ہی سے ٹرخا دوں کہ نہیں ہیں۔ ایک رشوت خور سرکاری افسر ریٹائر ہو گئے ہیں۔ فکر صاحب اُن کی کوٹھی پر ماتم پرسی کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ مگر میرا اتنا خوبصورت بہانہ چند سیکنڈوں میں ہی برباد ہو گیا، کیونکہ نوداردصاحب، دروازہ کھول کر اندر تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا، وہ ایک، بہت بڑے پریس کے مالک جناب گپتا صاحب ہیں اور یہ دیکھ کر تو میرے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ گپتا صاحب جو روزانہ شیو بنانے کے عادی تھے، اُنھوں

نے داڑھی رکھ لی ہے۔
قہقہہ لگا کر بولے۔ "ہوں، تو ابھی تک شیو کرنے کی عادت نہیں چھوڑی۔"
میں نے کہا۔ "اگر بلیڈ یونہی گم ہوتا رہا تو انشاء اللہ یہ شیو کی عادت بھی چھوٹ جائے گی۔ مگر گپتا جی! آپ کی یہ داڑھی؟ کیا آپ کے بھی بلیڈ گم ہو جاتے تھے۔"
بولے۔ "نہیں بھائی! اب خدا سے کچھ خوف آنے لگا ہے۔ سنا ہے داڑھی ہو تو یہ خوف کچھ زیادہ تکلیف نہیں پہنچاتا۔"
میں نے کہا۔ "ہاں داڑھی میں تنکا چھپانے سے آج کل کچھ خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ تنکا تو اب بے حد ضروری ہو گیا ہے۔"
گپتا جی کو میں عرصہ بیس برس سے جانتا ہوں۔ پہلے ہزاروں میں اور اب لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ روپیہ اپنی حدود سے کچھ زیادہ مہیا ہونے لگے تو خوف آنے لگتا ہے کہ کہیں خدا انھیں چھین نہ لے۔ چنانچہ اپنے گناہ چھپانے کے لئے انہوں نے داڑھی کا سہارا لینا شروع کر دیا تھا۔ اور میں اتنا احمق ہوں کہ خدا کے بجائے انسان سے خوف کھاتا ہوں۔ ابھی تک شیو کے چکر میں گھوم رہا ہوں ـــــ گپتا جی کو دیکھ کر سوچا۔ کیوں نہ میں بھی شیو سے نجات پا لوں۔ آخر شیو کرنا انسان کے لئے

ضروری تو نہیں، اور پھر فائدے ہزاروں، نہ ٹیلی فون کا خطرہ، نہ بلیڈ گم ہونے کی پرواہ، اور نہ وہ خواہ مخواہ طیش آئے گا۔ کہ جیسا مجھے گپتاجی کے آنے پر ہوا تھا۔ کہ میرے شیو کے موقع پر آن دھمکا۔ کسی کے گھر جانے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیئے کہ کہیں وہاں خانہ جنگی نہ ہو رہی ہو، اور گھر والے کوئی ایسی نعمت نہ کھا رہے ہوں۔ جیسے وہ کسی کے ساتھ "شیئر" نہیں کرنا چاہتے۔ خاص کر گپتا جی ایسے ہیرا پھیروں کے ساتھ کہ داڑھی کے ساتھ ہیرا پھیری میں کچھ اضافہ ہی ہوگا، کمی نہیں ہوگی۔

بیوی، بلیڈ دے گئی۔ مگر میں نے گپتا جی سے کہا۔۔۔

"فرمائیے! کوئی ضروری کام تھا کیا؟"

"ضروری تھا بھی اور نہیں بھی۔ مگر آپ پہلے شیو کر لیجئے۔ آپ لوتھر صاحب کو جانتے ہیں نا؟"

"میں نے کہا۔" لوتھر صاحب، شیو کے بعد۔۔۔ ذرا صبر کیجئے۔۔"

اور میں سیفٹی ریزر میں بلیڈ ڈالنے لگا۔ تو باہر سڑک پر اچانک زندہ باد۔ مُردہ باد کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی جلوس جا رہا ہو۔ میں بے اختیار شیو چھوڑ کر باہر آگیا۔ تو جلوس کے پانچ چھ آدمیوں نے مجھے پہچان لیا۔ اور آوازیں دینے لگے "آئیے، آئیے۔ آپ بھی اس کارِ خیر میں شامل ہو جائیے۔"

میں نے پوچھا ۔" کون سا کارِ خیر ہے؟"
جواب ملا ۔" آپ جانتے نہیں محلّے کی ایک نو بیاہتا لڑکی کو جہیز کی خاطر مٹی کے تیل میں جلا دیا گیا ۔ ہم اس کے خلاف یہ پروٹسٹ جلوس لے جا رہے ہیں ۔"
" وہ کس کی بہو تھی؟"
" اُسی سالے لوتھر کی جو بڑا سماج وادی نیتا بنا پھرتا تھا۔"
اور میں شیو کیے بغیر جلوس میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر نو بیاہتا بہوئیں اسی طرح روزانہ جلتی چلی گئیں تو شیو ترک ــــــ داڑھی رکھنی ہی پڑے گی ۔

آج کا عنوان ـــ خط

اگرچہ یہ تھیوری مجھے بے حد معقول لگتی ہے کہ کسی کے خط کا جواب آج مت دو، ہفتے بھر کے بعد سے دو۔ لیکن اس میں ایک خدشہ لاحق رہتا ہے کہ جواب اگر فوراً نہ دیا تو ایک اور خط آئے گا۔ جس میں تحریر ہو گا کہ جواب نہ آنے پر بڑی تشویش ہو رہی ہے کہ کہیں آپ کو ٹائیفائڈ تو نہیں ہو گیا۔ ویسے موسم تو ملیریا کا ہے۔ لیکن آج کل ٹائیفائڈ اور ملیریا مل کر ایک تیسری بیماری پیدا کر رہے ہیں۔ جو ڈاکٹروں کی فہم سے بھی بالاتر ہے ـــ مگر خدا کرے کہ آپ کو ٹائیفائڈ اور ملیریا نہ ہو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ کے مکان کی کوئی دیوار گر جائے۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہو آپ جواب ضرور لکھئے۔ ورنہ میں ٹرین پر سوار ہو کر آپ کے دولت کدے پر آ جاؤں گا۔

لہٰذا دوراندیشی برتئے، جواب فوراً بھیج دیجئے۔ ورنہ وہ اہل و عیال سمیت آپ کے گھر آدھمکے گا۔ اور یہ دھمکنا ٹائیفائیڈ سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ڈاکٹر کا بل مہمان کے بل سے ایک تہائی ہوتا ہے۔

جب میں اخبار ملاپ میں روزانہ ایک کالم لکھا کرتا تھا تو دوسرے ہی دن ایک صاحب مجھے خط لکھ کر شکایت کیا کرتے کہ آج آپ نے جو کالم لکھا ہے، وہ میری بیوی کے متعلق کیوں لکھا ہے۔ اگلے دن خط آتا کہ اپنے کالم میں آپ نے جس بڑھ کے پیڑ کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ہماری جائیداد ہے، آپ کی نہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو اُن کا غصیلا خط آگیا کہ آپ نے اپنے کالم میں میری بھینس کی توہین کی ہے کہ وہ صرف آدھ کلو دودھ دیتی ہے۔ باقی دو کلو اپنے تھنوں میں چڑھا کر غداری کرتی ہے۔ آخر دوسرے کے گھر کے اندرونی حالات کو ننگا کرنے کا آپ کو کیا حق ہے؟"

ہاں، ایسے حضرات کے خط کا جواب نہ آج نہ کل نہ ہفتہ بھر بعد دینے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ مجھے ایک قصباتی انکل کے پوتے کا خط آیا۔ لکھا تھا "پیارے انکل! دہلی میں کرکٹ میچ ہونے والا ہے۔ آپ میرے اور میرے دوست کے لئے میچ کے دو ایڈوانس ٹکٹ خرید لیجئے۔ اُمید ہے، آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ میچ کے تین دن ہمارا قیام و طعام آپ کے گھر ہی رہے گا۔ خط ملتے ہی جواب دیجئے۔ چچی جان کو سلام عقیدت!"

حسنِ اتفاق کہ میں اُن دنوں گھر پر موجود نہیں تھا۔ جے پور آیا گیا ہوا تھا۔ دیکھئے

یہ حسنِ اتفاق بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ چنانچہ سلام عقیدت والی چچی جان کا بیان ہے کہ میں نے برخوردار بھتیجے کو خط کا جواب لکھ دیا ہے کہ آپ کے انکل حیدرآباد گئے ہوئے ہیں آپ کا خط حیدرآباد بھیج دیا ہے۔

ہاں، ایسے خط کا جواب فوراً دینا چاہئیے تاکہ وہ کسی اور انکل کی طرف رجوع کریں لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ ایسے خطوط کا جواب فوراً مت دیجئے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو تین ہفتے بعد دیا جائے تو اس دوران میں کرکٹ نہ صرف شروع ہو جاتا ہے بلکہ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ نہ بھتیجا اپنے قصبے سے آتا ہے نہ انکل حیدرآباد سے۔

میرے پاس جو خط آتے ہیں، میں انہیں صرف ایکبار پڑھتا ہوں۔ ایک بار پڑھنے کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ردی کی ٹوکری اسی لئے بنائی جاتی ہے۔ مثلاً ان میں ایسے خطوط بھی ہوتے ہیں جو ٹیلیفون ڈائرکٹری کو سامنے رکھ کر بھیجے جاتے ہیں کہ ــ عزیزی طول عمر، راج نارائن کی شادی خانہ آبادی ۸ اکتوبر کو ہے۔ آپ کی شرکت لازمی ہے۔ ورنہ میں اس شادی کو ادھورا سمجھوں گا۔

اور یہ خط آپ کو ۱۰ اکتوبر کو ملتا ہے۔ شادی تو شادی، مجھے تو ایک مرتبہ جنازے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ جنازے میں نہی حضرات شامل ہوتے ہیں جن کا اپنا جنازہ بھی ایک نہ ایک دن ضرور نکلنا ہے۔ اس لئے احتیاطاً وہ ہر جنازے میں شریک ہوتے ہیں۔ تاکہ ہمارے جنازے بھی ....

لیکن جب میں جنازے میں شرکت کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اول تو جنازہ ایک دن پہلے سپرد خاک کیا جا چکا ہے۔ دعوت نامے میں تاریخ غلط چھپ گئی تھی۔ کسی خط میں ٹھیک کر دی گئی اور کسی میں نہیں کی جا سکی۔ کیونکہ جلدی بہت زیادہ تھی۔

اور دوسرے یہ کہ کسی صاحب نے یہ دردناک انکشاف کیا کہ آپ کو تو جنازے کی دعوت بھیجی ہی نہیں گئی۔ لفافہ کسی اور کے نام تھا۔ پوسٹ مین غلطی سے آپ کے گھر پھینک گیا ہوگا۔

غرض ہو یا جنازہ — آج نہیں تو کل بھی غلطی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور غلطی انسان کا نیچرل خاصہ ہے۔

آج کل ہم صنعتی دور سے گزر رہے ہیں۔ اور زندگی بھاگم بھاگ چلی جا رہی ہے اس تیز رفتاری میں کس کے پاس ٹائم ہے کہ خط آئے تو پورا پڑھ بھی سکے۔ جواب دینے کی منزل بعد میں آتی ہے ایک مرتبہ ایک مشہور و مقبول ادبی جمع نظمی رسالے کے پاس ایک صاحب گئے۔ بولے "جناب میں نے پانچ مہینے پہلے آپ کو ایک افسانہ بھیجا تھا"

ایڈیٹر بولا۔ "ضرور بھیجا ہوگا"

"مگر وہ ابھی تک نہیں چھپا"

"نہیں چھپا؟ تو واقعی نہیں چھپا ہوگا"

افسانہ نگار اشتعال میں آگیا۔ جھاگ وغیرہ بہا کر بولا "تو میرا افسانہ لوٹا دیجئے"

ایڈیٹر نے کمرے کے گوشے میں پڑی ہوئی ایک بوری کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اس میں سے ڈھونڈ لیجئے۔ افسانہ ضرور موجود ہوگا۔ ہم اپنی ڈاک کو بڑا محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک چٹھی تک ضائع نہیں ہونے دیتے"

مگر تیز رفتار مشینی زمانے سے پہلے زار روس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ اس دور کے ایک ناول میں میں نے ایک ناول پڑھا تھا جو مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ناول میں ایک

جاگیرزادہ تھا جو مسلسل پلنگ پر پڑا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا منشی اُس کے پاس آیا۔ کہنے لگا "حضور! دو ہفتے پہلے میں آپ کو ایک نہایت ضروری خط دے گیا تھا۔ مگر اس کا جواب نہیں لکھا گیا"

رئیس زادہ بولا "دو ہفتے؟ بڑے سست ہو؟ اب پوچھنے آگئے۔ مگر لیٹر پیڈ کہاں ہے؟"

"وہ بھی آپ کو دے گیا تھا۔ یہ دیکھئے، پلنگ کے نیچے گرا پڑا ہے"

"تو گرا رہنے دو۔ نیا لیٹر پیڈ لے آؤ۔"

"لاتا ہوں۔ مگر وہ ضروری خط تھا۔ حضور!"

"ہاں ہاں، ضروری ہوگا۔ مگر ہمارے لئے کوئی چیز ضروری نہیں ہوتی۔"

"اس لئے میرا خیال ہے آپ صرف تم اپنے خطوط نکال کر پڑھ لیا کیجئے۔ کیونکہ اُن میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انکا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا؟"

ختم شد